مذہب شیعہ امامیہ

تصنیف:
مولوی غلام علی گلزارؔ

زیرِ طباعت:
صوفی غلام حسین وکیلؔ

شعبۂ تبلیغات

معاون کمیٹی تنظیم المکاتب کشمیر

ہدیہ: ۲۰ روپے

کشمیر ایکسپریس کرن نگر

M.A. No 94

پیش لفظ

تاریخ کے نشیب و فراز میں، مسلمانوں کے اندر متعدد فرقے اور مذاہب نمودار ہوئے۔ جن کو سنی یا شیعہ کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ حضرت ختم المرسلینؐ کے بعد، مسلمان دو مکاتب فکر میں تقسیم ہوئے۔ (۱) شیعہ امامیہ (۲) اہل سنت اسلام دشمن سامراج اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں، مسلمانوں سے باہر اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیاں پھیلاتا رہا ہے۔ سب سے زیادہ منفی پروپگنڈا "مذہب شیعہ امامیہ" کے بارے میں کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مذہب شیعہ امامیہ کے اساسی عقائد اور مرکزی فقہ کو مثبت انداز فکر سے پیش کرنا بہر حال مفید ہے۔ کشمیر میں تحریک مکاتب امامیہ کے بانی و رہنما اور اتحاد اسلامی کے نقیب، جناب مولوی غلام علی گلزار نے "مذہب شیعہ امامیہ" کے موضوع پر مختصر، جامع، عام فہم اور دلچسپ کتاب لکھی ہے۔ تحریک مکاتب امامیہ کے ایک دیرینہ بہی خواہ جناب صوفی غلام حسین وکیل (ٹینگن ضلع بڈگام) نے طباعت کی رقم ادا کرنے کی پیشکش کی ہے، شعبہ تبلیغات معاون کمیٹی کے علاوہ مسودہ پر جناب پروفیسر سید سرور حسین (سابق ناظم تعلیمات کشمیر) نے مصنف کی تجویز پر تاثراتی نوٹ لکھا۔ نیز ڈیڑھ ہزار روپیہ کا عطیہ بھی اس کے لئے عنایت فرمایا۔

کتاب کو چھپواتے ہوئے ہمیں مسرت ہو رہی ہے۔ اُمید ہے محترم ارکان شیعہ و سنی حلقوں کے اہل علم و فکر حضرات اور ائمہ جمعہ و جماعت تک پہنچانے میں تعاون دیں گے

خادم تحریک: **سید احمد بیدار**، نگران سکریٹری معاون کمیٹی تنظیم المکاتب کشمیر
جون ۱۹۹۶ء

تأثراتی مکتوب از پروفیسر سید سرور حسین صاحب (شری بٹ سرینگر کشمیر) سابق ناظم تعلیمات

محترم و عالی مقام جناب غلام علی گلزار صاحب

السلام علیکم! آپ کی زیر طبع کتاب 'مذہب شیعہ امامیہ' کے مسودے کا بغور مطالعہ کیا آپ نے جس طریقے سے مذہب شیعہ امامیہ کو پیش کیا ہے وہ تحقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت شناسی پر مبنی ہے۔ آپ نے احسن طریقے سے اختلافی نکات کی وضاحت کی ہے تاکہ مسلمانوں کے ہر مسلک سے تعلق رکھنے والے حضرات ان سے واقف ہوں۔ اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ صدیوں سے چلا آرہا یہ تفرقہ جس کو مفاد پرست عناصر وقت وقت پر الجھاتے رہے' ایک دم ختم نہیں ہو سکتا ہے بلکہ آجکل کے اس دور میں علم اور تعقل سے اس کو کم کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی یہ کتاب اس سلسلے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں ایک معروف علمی شخصیت پروفیسر سید حسن نصر سابقہ وائس چانسلر تہران یونیورسٹی یوں رقمطراز ہیں:-

"شیعہ سنی تعلق ایک نازک اور مشکل مسئلہ ہے مگر میری یہ اوّلین کوشش رہی ہے کہ میں ان دونوں بڑی جماعتوں کو ایک متحد قوم کی حیثیت سے بنیادی اصولوں کے تناظر میں پیش کروں۔ یہ واقعی ایک مثبت اپروچ ہے جس سے ان دونوں فرقوں کو توحید کے اعلیٰ مرکز پر جمع کیا جاسکتا ہے۔"

آج کل کے اس پُر آشوب دور میں جبکہ مغربی ذرائع ابلاغ پوری شدت کے ساتھ اُمتِ مسلمہ میں دراڑ ڈالنے میں مصروف ہیں' ضرورت اس بات کی ہے کہ اتحادِ ملی کیلئے پُرعزم کوشش کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی یہ انمول کتاب حقائق سے دبیز پردے ہٹانے میں مددگار ثابت ہوگی۔ اس نیک کام کے لئے آپ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے گا۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے بہترین پیرائے میں ملی اتحاد کو یوں بیان فرمایا ہے

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں' اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

آپ کا خیر اندیش

سرور حسین

بِسْمِہٖ تعالیٰ

مَذہَبِ شیعہ اِمامیہ

مذہب کی افادی حیثیت

انسانی زندگی کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ انسان کی شخصی زندگی۔ ۲۔ نسل اور تہذیب کی بقاء کے لئے انسان کی گھریلو زندگی' ۳۔ سوسائٹی کو پُرامن اور خوشحال رکھنے کے لئے انسان کی معاشرتی زندگی۔ پہلی قسم کو حیاتِ شخصی' دوسری کو حیاتِ نسلی' تیسری کو حیاتِ عمرانی کہتے ہیں۔ تینوں قسموں کے درمیان اختلاف اور ٹکراو ہوتا رہتا ہے لیکن تینوں کے درمیان گہرا تعلق بھی ہے۔ یہ ایسا تعلق ہے' جو تین علاقوں (Areas) کے اصلی اور بنیادی رشتوں سے ملا ہوا ہے۔ ان تینوں میں جو اصول مشترک ہیں وہ انسان کی انسانیت سے تعلق رکھتے ہیں' انسان کو جب اور جہاں اپنی انسانی ضرورتوں کا احساس غالب ہو جاتا ہے' تب اور وہاں انسانی زندگی کی ان تین قسموں کے تعلق کی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے۔

اور ان کے درمیان کا ٹکراؤ اور تضاد کم ہو جاتا ہے۔

طبعی طور پر حیاتِ شخصی (Personal life) کے جذبات اور آثار سب سے زیادہ قدیم اور مضبوط ہیں، لیکن حیاتِ شخصی کے مقابلے میں، حیاتِ نسلی (گھریلو زندگی —— Family setup) کے جذبات اور ضروریات کو مضبوط کرنا ضروری ہے، اسی طرح زندگی کی تیسری قسم یعنی وسیع تر منزل، یعنی انسان کی معاشرتی زندگی جس کا نام "تہذیبِ انسانی" ہے، کو بھی حیاتِ شخصی کے مقابلے میں مضبوط کرنا ضروری ہے تاکہ باقی مخلوق سے انسان کے آداب و عادات اور اس کی سرگرمیوں کو ممتاز کیا جا سکے اور انسانی معاشرہ کو خوشحال رکھا جا سکے۔ اگر تمدن کی ترقی اور انسانی معاشرہ کا قیام مدِ نظر ہے تو، معاشرہ کے افراد کے تکبر، خود غرضی، خود پرستی اور جھوٹ کی تمام صورتوں کو دبانا ضروری ہے اور ان کے مقابلے میں ان کو ایثار، ضبطِ نفس، ہمدردی و تعاون، خدمتِ خلق اور سچائی کا عادی بنانا بھی ضروری ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ (ا) مصنوعی ذرائع اور خارجی تدابیر کو اختیار کرنا۔ (ب) روحانی و اخلاقی احساسات کو اُجاگر کرنا۔ دُنیا میں یہ دوسرا طریقہ یعنی (ب) سب سے زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہو چکا ہے، جبکہ پہلا طریقہ (ا) نہ دیرپا ثابت ہوتا ہے نہ مؤثر۔ طریقہ (ب) کو دنیا "مذہب" کے نام سے جانتی ہے۔ یعنی ایثار، دیانت، ضبطِ نفس،

خدمتِ خلق، سچائی وغیرہ کو اختیار کرنا اور جھوٹ فریب، قتل ناحق، چوری، غارت گری وغیرہ سے احتراز کرنا۔ ان قدروں کو مذہب نے معروف (allowed) اور منکر (forbidden) کا نام دیا ہے۔ طریقۂ مذہب کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ عقیدہ کے طور پر دل میں راسخ ہو جاتا ہے، اس لئے مصنوعی اور خارجی وسائل سے زیادہ مذہب کا مرکزی جوہر یہ ہے کہ یہ اعمال کے سزا و جزاء کی تحریک دیتا ہے۔ آخرت اور رُوحانی بقاء کا تصور ابھارتا ہے، کائنات کے خالق کا یقین پیدا کرتا ہے۔ رُوحانی اور اخلاقی قوت و کمال سے خالق کے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ جنت کے شوق میں بھوک، پیاس، محنت اور تکلیف کو صبر و ثبات سے برداشت کرنے کی قوت عطا کرتا ہے۔ جہنم کے خوف سے، خود غرضی، شہوت پرستی اور ظلم و زیادتی سے پرہیز پر آمادہ کرتا ہے۔ ایثار، سخاوت اور خدمتِ خلق کا شوق پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اچھے اور اونچے مقاصد کے لئے اپنے مال و جان کی قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ مذاہب کی مختلف صورتوں کی تفریق کا سبب، اصولِ مذاہب میں نفسی خواہشات کے مطابق انسان کی تحریف، اور برے رسومات و توہمات کا غلبہ ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ ان احساسات کے باوجود انسان اجتماعی طور پر زیادہ تر مذکورہ منفی صورت حال کو قابو میں رکھنے سے قاصر رہتا ہے۔ لیکن انسانی تاریخ میں قوموں اور معاشروں کے احساسات، تجزیات،

مشاہدات اور تجربات کا متواتر اصرار و اقرار ہے کہ انسانی نسل اور تمدن کی بقاء کے لئے "مذہب" جیسا مؤثر وسیلہ کوئی دوسرا مصنوعی طریقہ ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔

بعض معترضین سوال کرتے ہیں کہ اس غرض کے لئے مذہب کی کیا خصوصیت ہے، اگر فلسفۂ اخلاق کی تعلیم عام کر دی جائے اور لوگوں میں احساس بیدار کیا جائے کہ خوشحال اور پُرامن مُعاشرہ کے لئے بعض باتوں کا ماننا اور بعض کا نہ ماننا ضروری ہے۔ تب بھی یہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ مذہبی عقیدہ کے بغیر خالی انسانی اخلاق کی ضرورت کا ادراک عام سطح پر قائم کرنا کس کے بس کی بات ہے؟ ہر شخص کہاں اس قدر فلسفی اور عالم ہوگا کہ ان تمام تقاضوں کا ادراک (Percepti) کر سکے۔ مذہب میں بعض مافوق العقل چیزیں، یعنی جن کو عقل اپنی کسوٹی پر پرکھنے سے قاصر ہے۔ جیسے کرامات، روحانی کمالات بھی ہوتے ہیں۔ اگر ان کو نکال کر صرف عقلی مذہب، باقی رکھا جائے تو "مذہب" مذہب نہیں بلکہ صرف "ایک فلسفہ" رہے گا، جس سے فرد فرد کی عقلی کسوٹی کے مطابق عقلی جنگ چھڑ جائے گی، جس کے محرکات عموماً اور مجموعاً عقل "کم" اور ذاتی غرض "زیادہ" کے عوامل پر مشتمل ہوں گے۔

بعض فلسفی محرکات از استفادہ "مبادی فلسفہ ـــــ مولانا ماجد"

انبیاء کا مذہب اور مشن

دین اسلام کی اصلی ابتداء اور تکمیل دونوں حضرت محمدؐ (آخری نبیؐ) نے ہی نہیں فرمائی بلکہ آپؐ پر اس کی تکمیل ہوئی۔ دین اسلام حضرت آدمؑ سے حضرت خاتمؐ تک ابتدائی اصول و اخلاق کے لحاظ سے ایک رہا اور تبلیغ و توضیح کی رُو سے نشاندہی کے مراحل اور احکام کے لحاظ سے زمانوں اور مکانوں میں مختلف بھی رہا۔ اسلام کی اصل و اساس لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر، ابتداء سے آخر تک ہر نبی پابند رہا۔ انبیاء کرام علیہم السّلام کی جدّوجہد ان انسانی اور اخلاقی قدروں کو اُجاگر کرتی رہی جو احکام و سُنن کا محور اور جوہر ہے۔ جو انسان کی اجتماعی، انفرادی اور رُوحانی ترّقی کا ہدف ہے۔ جو انسان کی خلقت کا منشاء ہے۔ اور جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کی خدمت پر لگا دیا ہے۔

پروردگار عالم نے حضرت آدمؑ کو خلق فرمایا اور اُن کے قلب میں بصیرت کا نور روشن کیا جس کا ماحصل لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی معرفت تھی۔ تمام انبیاءِ کرام کے مشن کا مرکزی نقطہ اور دین و شریعت کا محور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ رہا۔ انبیاءِ کرام کے مختلف ادوار میں زمانوں کی شرعی ضروریات اور اصلاحی محرکات کی طرف مخصوص توجہ کے باوجود ہر پیغمبر نے اپنی اپنی قوموں کو جن میں وہ مبعوث ہوئے تھے ایک مرکز پر جمع کیا اور شرک سے اپنے نفسوں اور معاشرہ کو پاک و صاف رکھنے کی ترغیب دیتے رہے۔ اُولوالعزم رسولوں

سے درمیان کے ادوار کو اس طرح پانچ حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ حضرت آدمؑ سے حضرت نوحؑ تک کا زمانہ
۲۔ حضرت نوحؑ سے حضرت ابراہیمؑ تک کا زمانہ
۳۔ حضرت ابراہیمؑ سے حضرت موسیٰؑ تک کا زمانہ
۴۔ حضرت موسیٰؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک کا زمانہ
۵۔ حضرت عیسیٰؑ سے ختم المرسلینؐ تک کا زمانہ

قرآن مجید میں کل پچیس ۲۵ پیغمبروں کے نام ظاہر کر دئے گئے ہیں جبکہ احادیث سے واضح اور مشہور ہے کہ مختلف قوموں اور سرزمینوں میں اللہ کی طرف سے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث ہوئے جن میں تین سو تیرہ ۳۱۳ رسول تھے اور پانچ ۵ اُولوالعزم (مذکورہ بالا ۱ تا ۵) رسولؐ تھے۔ قرآن میں چند اور انبیاء کی طرف واقعات کے سلسلے میں اشارہ ہے، جیساکہ مختلف تفاسیر میں بیان کیا گیا ہے جیسے حضرت شمویل، حضرت شمعون، حضرت یُوحنا ــــ بعض برگزیدہ بندگانِ خُدا کا بھی کلام اللہ میں تذکرہ ہے۔ جیسے حضرت یوشع بن نون، حضرت حزقیل، حضرت حبیب نجار، حضرت لقمان، حضرت عزیرؑ، حضرت طالوت وغیرہ۔ (دورۂ چہارم) حضرت خضرؑ کا بھی تذکرہ ہے جن کو علم لدنی عطا کیا گیا ہے اور جو زندہ ہیں۔ چنانچہ دورۂ دوم کی ایک ــــ مذکورہ فی القرآن، عظیم الشان مشہور شخصیت سکندر ذوالقرنین ہیں۔ چار رسولوں پر واضح کتب توراۃ، زبور، انجیل، قرآن کو نازل کیا گیا، بعض رسولوں

پر صحیفے نازل ہوئے جیسے حضرت ادریسؑ کا تذکرہ ہے۔ قرآن میں وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ کا اعلان بھی ہے، یعنی ہر قوم میں ہدایت کرنے والا بھیجا گیا جیسے سرزمین فلسطین پر حضرت عیسیٰؑ، حضرت یسع وغیرہ مدائن میں حضرت شعیبؑ، مصر میں حضرت موسیٰؑ وغیرہم۔ بعض تحقیقات میں سنسکرت زبان "نُو" سے نوحؑ مراد لیا گیا ہے۔ بعض تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ کرشن نے مہابھارت کے معرکہ کے دوران رحمۃ للعالمینؐ (آخری آنے والے رسولؐ) کو دُعا میں وسیلہ لایا تھا۔ غرض یہ مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ انبیاء کے مبعوث کرنے سے اللہ تعالیٰ کا منشاء انسان کی ہدایت ہے۔ اور کسی انسان کے لئے یہ نہیں چاہتا ہے کہ وہ گمراہ ہے۔ اسی لئے اس نے تمام قوموں میں انبیاء کو بھیجا اور جہاں اس مشن میں کمزوری آئی، اولیاء و مصلحین کے ذریعے اصلاحی تحاریک کے توفیقات کو روشن فرمایا۔ بنیادی مسئلہ انسان کی ہدایت ہے۔ تاکہ وہ انسانیت اپنائے، حیوانیت، شہوانیت، انانیت، نفسانیت وغیرہ کو قابو میں رکھے۔ اور ایک مہذب زندگی گذارے جو اسے حیوانات اور دوسرے موجودات سے ممتاز کردے۔ یہی انبیاء کا مذہب ہے جو انہوں نے انسان کو سکھایا۔ اس کے اہداف کو "دین" اور اس کے آداب و قواعد کو "مذہب" قرار دیا گیا۔ شریعت ان قواعد کی نشاندہی کرتی ہے، جس کے لئے ضروری ہے کہ نئے مسائل کے لئے آخری کتاب قرآن اور آخری رسولؐ

کے بتائے ہوئے طریقے یعنی سنّت سے مسائل کو استنباط کرکے حکم پر عمل کیا جائے۔

اسلامی اقدار کی فطری نوعیت

انسان جب کائنات اور اس کی باریکیوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو فطری طور پر خالق کا معتقد ہو جاتا ہے اور اُس پر ایمان لانے پر مستعد ہو جاتا ہے۔ اللہ کی اس کائنات میں چیونٹی اپنے سے ساٹھ گنا وزن اٹھاسکتی ہے جبکہ عموماً انسان اپنے سے تین گنا وزن تک اٹھاسکتا ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات، ارض و سماوات کا مشاہدہ اسے متوجہ کراتا ہے۔ وہ خالق اور آخرت پر ایمان لانے کو فطری تقاضا سمجھتا ہے۔ مجرموں کے جرائم کی سزا اور نیکوں کے اچھے اعمال کی پاداش، انسان کی فطرت کی آواز ہوتی ہے اور انسان عام طور پر یہ دیکھتا ہے کہ اچھوں کو نیکی اور بُروں کو برائی کی حقیقی جزا و سزا دنیا میں نہیں ملتی۔ مثلاً وہ قاتل و جابر محارب جس نے اسلام سے بغاوت کرکے ناحق لاکھوں انسانوں کا قتل کیا ہو، دنیا میں صرف زیادہ سے زیادہ پھانسی پاتا ہے۔

اسلام میں افراط و تفریط نہیں ہے۔ انسان کے نفسی ضروریات سے بے توجہی تفریط ہے اور ان کو قابو میں رکھے بغیر آزاد چھوڑ دینا افراط ہے۔

اسلامی قوانین کی خصوصیت عدالت (Justice) ہے۔ اسلامی

قوانین ہر قسم کے ظلم و ناانصافی سے پاک ہیں خواہ وہ قانون سازی کا مرحلہ ہو یا نفاذ کا۔ اسی طرح اسلامی نظام کا فطری تقاضا ہے کہ نظم پر دسترس حاصل کرنے کے لئے منظم جدّوجہد کی جائے، جبر و زیادتی سے حاصل کیا ہوا نظمی اختیار اسلامی نہیں ہوسکتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ظلم و زبردستی سے کسی کی ملکیت پر تسلّط کرے پھر ثواب کی نیّت سے اس کو غریبوں میں تقسیم کرے۔ ظالم کے ساتھ مشروع حدود میں سختی ایک چیز ہے، ظلم سے کسی کا حق چھین لینا دوسری چیز ہے۔ اسلام میں رنگ و نسل، فقیری و امیری فوقیت کا معیار نہیں۔ اسلام نے نسل پرستی اور طبقاتی امتیازات کی مخالفت کی ہے۔ قرآن مجید میں تمام انسانوں کو "یَا اَیُّھَا النَّاسُ" اور "یٰبَنِیْ اٰدَمَ" سے خطاب کیا گیا ہے۔ تمام انسانوں کو ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد قرار دیا گیا ہے۔ اسلام میں قانون سازی یا اس کی عملداری انسانوں کے بے شعور میلاناتِ طبع کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ اس کا دارومدار بندوں کی سعادت پر ہے۔

مذہب شیعہ امامیہ

انسان کے لئے مذہب کی فطری ضرورت اور اُس کی خلقت کے مقصد کی کچھ وضاحت کے بعد کتاب کے موضوع یعنی "مذہب شیعہ امامیہ" پر کچھ روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

دُنیائے مشرق و مغرب کے مذہبی تعلیمات کی تحقیق و تدریس میں سب سے زیادہ مذہب شیعہ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یعنی اس کو نزدیک سے جاننے اور درس و تدریس میں اس کا موقف سمجھانے کی بجائے اس کو ایک "گروپ" کا رنگ دیکر پیش کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ دنیا مذہب شیعہ امامیہ کی اصلیت سے واقف ہو جائے اس سے بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ جن کا سامنا آج دنیا کو اور خصوصاً اُمتِ مسلمہ کو ہے۔ شیعہ مذہب اسلام سے کوئی الگ مذہب نہیں بلکہ مذہب اسلام کی ایک تاریخی حقیقت اور واقعیت کا نام ہے۔ اس کو دُنیا کے بعض حلقوں میں ایک ایسی تحریک کا نام دیا گیا ہے جس سے اسلامی اتحاد ٹوٹ گیا ہو، حالانکہ ناگزیر واقعیت کے طور پر یہ ابھرا اور قرآنی پیغام کو لیکر پھیلا، اماموںؑ کے ہاتھوں اس کے خد و خال مرتب ہوئے۔ اور فقہائے مجتہدین اس کے اصول و فروع کو شکل دیتے رہے۔ اس میں اجتہاد منظم اور متواتر ہے۔ اور یہ مذہب دنیا میں مسلمان کو خصوصاً اور انسان کو عموماً آنے والے اخلاقی و معاشرتی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ دوسرے مذاہب میں مختلف اصطلاحات کی طرح 'اسلام' کو بھی دو طرح پیش کیا گیا۔ سُنّی مذہب اور شیعہ مذہب۔ یہ دونوں طریقے اگرچہ متعدد اصول و فروع میں تضاد رکھتے ہیں لیکن قرآن کو اللہ کی کتاب سمجھنے اور چند مفاہیم میں اختلاف کے ساتھ اسلام کے جوہری اصول میں متفق ہیں۔ شیعہ مذہب

کی بنیاد جوہری اصول کے بعد اس اعتقاد پر ہے کہ اگرچہ نبوّت و رسالت کا سلسلہ حضرت محمد مصطفیٰ صلعم پر ختم ہوا لیکن سلسلۂ عصمت و ہدایت 'امامت' کے عنوان سے قائم رہا۔ تاریخ اسلام کے سانحہ عظیم یعنی واقعہ کربلا کے بعد سیاسی اور اجتماعی طور پر خصوصاً "شیعہ امامیہ" امت مسلمہ کے حدود کے اندر، ایک کمیونٹی کی صورت میں اُبھرے۔ اگرچہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر کئی اور مکاتب فکر اور مذاہب بھی اُبھرے۔ جن سے کچھ تاریخ کے دھارے میں تحلیل ہوئے اور کچھ باقی رہے۔

مسلمانوں میں مختلف فرقوں کا پیدا ہونا اور تحلیل یا منجمد ہو جانا

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمان تین فرقوں میں تقسیم ہوئے۔

۱۔ ایک فرقہ جو حضرت علی بن ابی طالب علیہ السّلام کی خلافت کے حق میں تھا، ان کا اعتقاد تھا کہ رسول اللہ صلعم نے حضرت علیؑ کو اپنے بعد خلافت کے لئے متعین کیا ہے۔

۲۔ دوسرا فرقہ انصار سے تعلق رکھتا تھا۔ جنہوں نے سعد بن عبادہؓ کو خلیفہ بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ جب مہاجرین کی تحریک پر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا سلسلہ چلا تو چند ایک کے بغیر ان لوگوں نے اُن کی بیعت کی۔ سعد بن عبادہ بعد میں نامعلوم اور پُر اسرار طور پر

قتل ہوا اور یہ فرقہ اس طرح ناپید ہی ہوا۔

۳ ــــ تیسرا فرقہ ان مہاجرین کا تھا جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی تحریک میں پہل کی، بیعت کے بعد اس میں وسعت ہوئی۔ ان میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو حق خلافت علیؑ کے مخالف تھے اور دوسرے وہ جو اس سلسلے میں کوشاں تھے اور وہ اجتماعی نظم کی حفاظت کے لئے اور امن عامہ کے لئے اظہار رائے سے کتراتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں میں بنیادی طور پر دو فرقے نمودار ہونے لگے ایک کو پہلے پہلے شیعانِ علیؑ کہا گیا۔ پھر امامت کا سلسلہ آگے چلنے کے ساتھ ساتھ "شیعہ امامیہ" کہا گیا۔ دوسرا فرقہ اہل سنت مشہور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں میں یہ مسئلہ ابھرتا رہا کہ فعلاً صورت حال ایسی تھی کہ اکثریت نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن اہل حق خلافت اور خلافت کے معیار اور فضائل ابوبکرؓ و علیؑ پر بحثیں ہوتی رہیں۔ اس طرح شیعہ امامیہ فرقہ مختص ہوگیا۔ شیعہ فرقہ میں کئی مکاتب سلوک و فکر ابھرے جو یا ختم ہوئے یا مجرد اور محدود ہو کر باقی ہے۔ البتہ دنیا میں محیط اور مؤثر "فرقہ شیعہ امامیہ" رہا جن کو اثنا عشری یعنی بارہ امامی بھی کہا جاتا ہے۔

اہل سنت کے نام پر متعدد فرقے اور مکاتب فکر ابھرے، جن میں اکثر مجرد و محدود ہوئے۔ چار مذاہب معروف ہوئے۔

شیعہ نام سے منسوب متعدد گروپ

۱۔ کیسانیہ :۔ یہ ایک گروپ تھا جو حضرت علیؑ کے بعد محمد بن حنفیہ (فرزند علی بن ابی طالبؑ، جس کی والدہ قبیلۂ بنی حنفیہ سے تھیں) کی امامت کا معتقد تھا۔ اس کی ایک دلیل یہ دیتا تھا کہ جنگ جمل میں حضرت علیؑ نے پرچم محمد بن حنفیہ کے ہاتھوں میں دیا تھا۔ اُن میں ایک گروہ کہتا تھا کہ اس کو امام حسینؑ کے بعد امامت ملی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ جب امام حسینؑ نے مدینہ سے مکّہ کی طرف بیعت یزید کے اصرار کو ٹالنے اور مسلمانوں کی خونریزی کو بچانے کے لئے ہجرت کی تو محمد بن حنفیہ سے خاص وصیت کی۔ چنانچہ ایک چھوٹے گروہ نے محمد کے بیٹے ہاشم کو امام مانا اور ہاشمیہ کہلائے۔ کئی چھوٹے گروہوں میں بٹ کر یہ فرقہ بھی تحلیل ہو کر رہ گیا۔

۲۔ مختاریہ :۔ کوفہ میں کیسانیہ کے ایک گروہ نے مختار بن ابی عبید ثقفی کی پیروی کی۔ چند برس تک مختاریہ نام سے مشہور ہوئے۔

۳۔ زیدیہ :۔ یہ حضرت زید بن علی بن حسینؑ کے پیرو تھے، اور زیدیہ کہلائے۔ اگرچہ حضرت زید خود امام وقت امام صادقؑ کے معتقد

تھے۔ لیکن بنو اُمیّہ کے ظالم حکمران کے خلاف شہادت کے بعد صفحۂ تاریخ پر کئی صدیوں تک زیدیہ فرقہ اُن کو امام مانتا رہا۔ بعد میں کئی گروہوں میں بٹ کر قریب قریب گم ہی ہوا۔ آج نہ ہونے کے برابر ہے۔

۴۔ ایک گروپ باقریہ نام پر ابھرا۔ وہ امام باقرؑ کو ہی مہدیؑ موعود سمجھتے تھے۔

۵۔ **ناووسیہ :۔** عجلان بن ناووس بصری۔ ان کا اعتقاد تھا کہ امام جعفر صادقؑ بقیدِ حیات ہیں اور ظہور کریں گے۔ جلد ہی یہ گروپ بھی محو ہو گیا۔

۶۔ **افطحیہ :۔** یہ لوگ عبداللہ افطح جو امام صادقؑ کے سب سے بڑے فرزند تھے، کے بارے میں معتقد تھے کہ وہی امام صادقؑ کے بعد امام تھے حالانکہ وہ امام صادقؑ کے بعد صرف ستّر روز تک ہی زندہ رہے، اس کے معتقدین امام موسیٰ کاظم (ساتویں امام) کے پیرو ہوئے۔ یہ گروپ ساتھ ہی تحلیل ہوا۔ البتہ بعض لوگوں اور حکومت کے ایجنٹوں نے کوشش کی کہ گروپ باقی رہے۔ استعماری ایجنٹوں نے ایسی شخصیتوں کو ہمیشہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔

۷۔ **مسمیطیہ :۔** یہ گروہ محمد بن جعفر کی امامت کے قائل ہوئے اور بہت تھوڑے رہے۔

۸۔ **اسماعیلیہ :۔** یہ ایک نمایاں فرقہ مسلمانوں میں ہے اور دنیا کے کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ فرقہ حضرت امام جعفر صادقؑ کے بعد اُن کے فرزند اسماعیل کی امامت کے قائل تھے۔ حالانکہ وہ حیاتِ امام صادقؑ کے زمانہ میں ہی دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے محمد بن اسماعیل کو امام مانا۔

۹۔ **موسویہ :۔** امام جعفر صادقؑ کے بعد جب امام موسیٰ کاظمؑ (جو اگرچہ اولادِ اکبر میں نہ تھے لیکن امامت کے باطنی و ظاہری شرائط کے تحت اہل تھے) امام ہوئے تو ایک گروہ نے اُنہی کو قائم مانا یعنی اُن کو آخری امام مانا اور وہ "موسویہ" کہلائے۔ حالانکہ خود امام موسیٰ کاظمؑ نے امام رضاؑ کو آٹھواں امام متعارف کرایا تھا۔

۱۰۔ **غالیہ :۔** مختلف زمانوں میں بعض لوگوں نے ائمہ طاہرین (بارہ اماموں) کے بارے میں غلط خبریں اور اعتقادات پھیلائے اور مخالف فرقوں نے شیعوں کے متعلق اُنہی کی مبالغہ آرائیوں کو ذریعہ بنا کر

شیعہ امامیہ کو بھی اس میں لپیٹ لینے کی کوشش کی حالانکہ شیعہ امامیہ (اثنا عشریہ) جو بارہ اماموں (حضرت علیؑ سے امام مہدیؑ تک) کا قائل ہیں، غالیہ شیعوں کے ان اعتقادات کو باطل قرار دیتا ہے ۔ مثلاً خدا کے حلول کا ائمہ میں قائل ہونا۔ کبھی امام کو اللہ یا رسولؐ پر غلو کرتے ہیں ۔ اس طرح اسلام کے بنیادی اعتقاد کے متضاد ہیں ۔ جس کو فرقہ امامیہ ردّ کرتا ہے ۔ ان لوگوں میں زیادہ فعّال "سبائیہ" ہے جن کا سردار عبداللہ بن سبا تھا جس نے مشہور کیا کہ حضرت علیؑ (نعوذ باللہ) خدا ہے ۔ شیعہ امامیہ کی تحقیق اور عقیدہ کے مطابق یہ شخص اسلام دشمن قوموں کا پروردہ اور تنخواہ دار منحرف شخص تھا۔ یہ گروپ بھی کئی گروہوں میں بٹ گیا، جیسے ۔ مغیریہ، خطابیہ، مفوضہ اور مشہور گروہ نصیریہ ـــــ سب تاریخ کے دھارا میں تحلیل یا بے اثر ہوئے البتہ نصیریہ کہیں کہیں بہت کم تعداد میں اب بھی موجود ہیں ۔ نصیریہ کو شیعہ امامیہ کافر قرار دیتے ہیں ۔ مفوضہ کہتے تھے کہ خدا نے پہلے آنحضورؐ میں تدبیر عالم کو منتقل کیا پھر ان کے بعد حضرت علیؑ میں پھر دوسرے ائمہ طاہرینؑ میں ۔ اس فرقہ کو بھی شیعہ امامیہ خارج از اسلام قرار دیتے ہیں ۔ اُن (نصیریہ) کا اعتقاد دو طرح کا ہے۔

۱۔ امام مہدی (نعوذ باللہ) خدا ہیں، ۲۔ امام علیؑ (نعوذ باللہ) امر نبوت میں شریک پیغمبرؐ ہیں۔ یہ دونوں عقیدے باطل ہیں۔ اسی

طرح بہت سے ایسے فرقے گروہ "شیعہ" نام پر مشہور ہوئے، اُن کو شیعہ امامیہ منحرف بنیادی عقائد کی وجہ سے ردّ کرتے ہیں یا اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔

شیعوں کا عالمگیر (اسلامی) فرقہ یعنی شیعہ امامیہ (اثنا عشریہ)

اثنا عشر = بارہ ۱۲، اس سے مراد ہے آنحضورؐ کو ختم المرسلین اور آخری نبی ماننے کے بعد ہدایت کا مرکز اور منبع بارہ ۱۲ اماموں کو ماننا، جن کے اوّل حضرت امام علیؑ اور آخری امام مہدیؑ ہیں ۔ شیعہ خیر و شر اور عدل الٰہی کے بارے میں خصوصی اور واضح عقیدہ اور نظریہ رکھتے ہیں جس کے بنیادی نظریہ سے اکثر مشائخ اہل سنّت بھی متفق ہیں لیکن عام طور پر یہ نظریہ کہیں کہیں تضاد کو ظاہر کرتا ہے ۔ شیعہ امامیہ کے نزدیک عقیدہ توحید اور عقیدہ عدل میں چولی دامن کا رشتہ ہے ۔ مذہب امامیہ کے بنیادی اصول و عقائد یہ ہیں جن کو اصول دین کہا جاتا ہے۔

۱۔ توحید، ۲۔ عدل، ۳۔ نبوّت، ۴۔ امامت، ۵۔ قیامت۔

جو ان اصولوں کو نہ مانتا ہو، وہ مذہب امامیہ سے خارج ہے، ان میں تین کو اسلام کے بنیادی و عمومی اصول قرار دیا گیا ہے یعنی ۱۔ توحید ۲۔ نبوّت اور ۳۔ قیامت (آخرت) ـــــ جو ان کو نہ مانتا ہو

وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

شیعہ امامیہ کے اصول و فروع اور سنّی و شیعہ اختلافات و خطوطِ اتحاد پر کچھ تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔ پہلے ان مشہور فرقوں اور گروپوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا جائے گا جو تاریخ اسلام میں "سنّی" نام پر مشہور ہوئے پھر ان میں سے بہت سے فرقے تحلیل ہوئے یا سمٹ گئے۔ اور جو باقی تواتر کے ساتھ ہیں وہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مسلک ہیں۔

سُنّی نام کے متعدد گروپ اور فرقے :-

یہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ آنحضور صلعم کی رحلت کے بعد جو لوگ حضرت علیؑ کے حق خلافت کے قائل تھے وہ شیعانِ علی کہلائے معاویہ بن ابی سفیان اور بنو امیہ کے دوسرے ظالم حکمرانوں کے دور میں شیعانِ علیؑ پر سخت مظالم ڈھائے گئے۔ بنو امیہ کے زوال اور بنو عباسیہ کی تگ و دو کے زمانہ میں علماء و مشائخ کو قرآن و سنت کی روشنی میں فقہ مرتب کرنے کا مناسب اصول ملا تو سب سے پہلے حضرت امام جعفر صادقؑ نے فقہ سنہ ۱۴۸ھ میں مرتب کیا۔ جو فقہ امامیہ مشہور ہوا، انہوں نے علم کلام، رجال اور رموزِ تفسیر کے

اصول و قواعد بھی مدوّن اور مقرر فرمائے۔ تمام علماء و فقہائے زمانہ کو ان کے تبحّر اور پاکبازی کا اعتراف تھا۔ ائمہ طاہرینؑ نے مسئلہ عصمت سے باہر کہیں بھی کسی سے علمی استفادہ نہیں کیا۔ امام صادقؑ کے درس میں امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ نے بھی شمولیت کی۔ سنہ ۱۵۰ھ میں امام ابو حنیفہؒ نے دوسرے فقہاء کی مشاورت سے فقہ مرتب کیا جو فقہ حنفی اہل سنّت مشہور ہوا۔ اور آگے دوسرے مسلک بھی نمودار ہوئے لیکن اس زمانہ سے پہلے جن گروپوں نے وقتی طور ہی پر قرآن و سنّت کو آڑ بنا کر حضرت علیؑ کی مخالفت کی وہ اہل سنت نام ہی سے متعارف ہوئے اگرچہ ائمہ اہل سنّت اور متقی مشائخ زمانہ نے ان کو ردّ کیا۔ جس طرح متعدد "شیعہ" نام کے فرقوں اور گروپوں کو ائمہ طاہرینؑ کے قول و فعل کی رو سے شیعہ امامیہ (بارہ امامی) فرقہ نے بنیادی اصول و عقائد سے انحراف کی وجہ ردّ کیا۔

۱۔ خوارج :- ان لوگوں نے معاویہ بن ابی سفیان کی طرف سے بغاوت کے جنگ (جنگ صفین) میں "حکمیت" کے مسئلہ پر حضرت علیؑ کے خلاف خروج کیا۔ ان کے محرک تین افراد اشعث بن قیس کندی، مسعر بن فدکی تمیمی اور زید بن حصین طائی تھے۔ یہ خارجی کہلائے۔ یہ لوگ حضرت علیؑ کے سخت دشمن ہوئے۔ انہی میں سے ایک پیرو عبدالرحمان ابن ملجم نے مسجد کوفہ میں حضرت علیؑ

پر فریب سے سرِ مبارک پر وار کیا جس سے وہ شہید ہوئے۔ یہ اگرچہ شیعان علیؑ کے مخالف ہونے کی بناء پر "سنّت کے پیرو" یعنی اہل سنّت متعارف ہوتے تھے اور دشمنان علیؑ و ظالم حکمرانوں نے ان کی ہر چند حوصلہ افزائی بھی کی لیکن مشائخ اہل سنّت نے آگے ان کو ردّ کیا۔ اور ان کو "خارجی" قرار دیا۔ یہ فرقہ اب فعلاً دنیا سے ناپید ہو چکا ہے۔ ان لوگوں کا اعتقاد تھا کہ جو مسئلہ جس طرح رسول کریمؐ نے انجام فرمایا وہ اسی طرح انجام دینا ہے۔ یعنی اگر سنّت میں کوئی چیز نہیں ملے گی تو کچھ کرنا ہی نہیں ہے۔ اس لئے اہل سنّت مشہور ہوئے لیکن اہل سنّت نے ان کو "فتنہ کوش" قرار دیکر ردّ کیا۔

۲۔ مرجیئہ بنو امیہ نے بہت سے انحرافی اعتقادات کو رائج کیا جن کے اثرات صدیوں تک باقی بھی رہے۔ جیسے بادشاہ ظل اللہ ہوتا ہے اور کسی برائی یا فحش و منکر پر اس کی تجدید یا امر بالمعروف کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ قرآنی احکام و نصوص اور سنّت کے عین برعکس ہے۔ قرآن میں موسیٰؑ و فرعون، ابراہیمؑ و نمرود، طالوت و جالوت وغیرہ کے واقعات اور ظالم و ظلم کے خلاف انبیاء کے رول کی واضح عکاسی موجود ہے۔ نیز پیغمبر اکرمؐ کی سنّت اس کی آئینہ دار ہے۔

بنو امیہ نے اپنے شاہی اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے مرجیئہ فرقہ کو جنم دیا تھا۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ایمان یک قلبی امر ہے، عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ (گویا) اگر افعال مختلف ہوں لیکن کسی کے ایمان کے بارے میں قطعاً شک بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہتے تھے کہ کبائر (رئیس لوگوں) کے گناہ کبیرہ پر نہی عن المنکر ضروری نہیں اور تعزیرات شرعی کے تحت ان کا قتل جائز نہیں۔ اس کے لئے قیامت تک تاخیر کو روا رکھتے تھے۔ یہ روش سنت رسولؐ اور سیرت خلفائے راشدینؓ کے خلاف ہونے کی بناء پر اہل سنّت میں مقبول نہیں ہو سکی۔ گرچہ "سُنّی" ہونے کو "سپر" بنا کر بعض افراد اب بھی "یزید" جیسے کافر، ظالم اور فاجر کو خلیفہ برحق اور امیر المؤمنین کہتے ہیں جس کا وحی نبوت سے انکار بھی تاریخ سے ثابت ہے اور معاذ اللہ امام حسینؑ کو 'باغی' قرار دیتے ہیں اور اس طرح امام حسینؑ (بشمول پنجتن پاکؑ) کی طہارت و پاکیزگی کے تواتر سے منکر ہو جاتے ہیں۔ جس میں کسی صحابی کو انکار نہ تھا، حتّٰی کہ معاویہ بن ابی سفیان نے اس کا اقرار بھی کیا تھا لیکن جس نے حسد اور منافقت کی وجہ سے سانحہ "کربلا" کے لئے فضا کو دیدہ و دانستہ سازگار بنا کر ہی دم لیا تھا۔ فقہاء و مشائخ اہل سنّت نے اس فرقہ کو ردّ کر دیا۔ مرجیئہ مضبوط اعتقاد کی بنیاد نہ رکھنے کے نتیجہ میں چھ گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ یونسیہ، عبیدیہ،

عنانیہ، ثوبانیہ، تومنیہ اور صالحیہ۔ پھر مجموعاً ناپید ہوئے۔

۳۔ جبریہ :۔ یہ فرقہ عجیب اعتقاد رکھتا تھا کہ انسان کے تمام افعال خدا ہی کراتا ہے اور انسان کے ارادہ کو اس میں کوئی دخل ہی نہیں۔ مثلاً قتل، زنا، چوری، ڈکیتی، شراب نوشی جیسے امور انسان کے ہاتھوں خدا ہی کراتا ہے۔ علماء و مشائخ نے ان کو ہر چند سمجھایا کہ پھر یہ جنّت و جہنّم، سزا و جزاء، گناہ و ثواب، عدل و ظلم وغیرہ کیا معنی رکھتے ہیں۔ شریعت میں تعزیراتی احکام کیوں ہیں۔ رسول اکرمؐ کی سنّت پھر تو ہین عدل پہ قائم کیوں ہے؟ خلفائے راشدین نے کیوں شرعی تعزیرات کو رائج کیا؟ —— یہ لوگ بندہ کے کسی بھی ارادہ و اختیار کے قائل نہیں ہیں اور ان کے پروپیگنڈہ سے عموماً اجتماعی کردار زد میں آکر مجروح ہو جاتا ہے۔ بعض حلقے "صوفی ازم" کو "سپر" بنا کر ایسے منحرف خیالات کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ اثرات و خیالات کہیں کہیں اگرچہ آج بھی باقی ہیں، لیکن اجتماعی طور پر بطور فرقہ "جبریہ" نمایاں نہیں ہے۔ جبریہ تین گروہوں جہمیہ، بخاریہ اور ضراریہ میں تقسیم ہو کر بے اثر ہوئے۔

ایک توضیح :۔ یہ واضح رہنا چاہئے کہ شیعہ امامیہ اس اعتقاد کو خارج از اسلام سمجھتا ہے کہ انسان "مجبور محض" ہے اور یہ کہ ہر امر "جبر" کے تحت ہے۔ وہ اس قول امام صادقؑ کو اپنے

عقیدہ کا عنوان قرار دیتے ہیں "لَا جَبْرَ وَلَا قَدْرَ وَلٰکِنْ اَمْرٌ بَیْنَ اَمْرَیْنِ" یعنی نہ جبر محض ہے نہ قدر محض ہے بلکہ دونوں امور کے درمیان کی صورت ہے۔ یعنی انسان نہ کُلی طور پر مجبور ہے نہ کُلی طور پر مختار ہے۔ وہ عموماً وسائل میں مجبور ہے، ارادہ میں مختار ہے۔ سزا و جزاء ارادہ سے تعلق رکھتا ہے جس کی بنا پر عمل سامنے آتا ہے۔ یہی روش متعدد مشائخ و فقہائے اہل سنّت کی بھی ہے۔ البتہ عام سطح پر خیر و شر کے بارے میں غلط اندازے اور غلط فہمیاں ہیں جس سے اجتماعی کردار مجروح ہوتا ہے، اور جس کے اصلاح کی ضرورت ہے۔

تفسیر نعیمی میں مثنوی شریف مولانا رومؒ کے حوالے سے ایک واقعہ

ایک جبریہ مذہب کا آدمی انگور کے باغ میں گیا اور پھل کھانے لگا۔ اتفاقاً باغ کا مالک آگیا، اور بولا کہ میری اجازت کے بغیر پھل کیوں توڑتا ہے؟ وہ بولا ـــ "خدا کا بندہ، خدا کے حکم سے خدا کے پھل کھا رہا ہے! میرا اس میں کیا اختیار ہے؟ تو رب سے کہہ کہ تیرے پھل کیوں توڑوا رہا ہے!" مالک نے غلام کو حکم دیا کہ اسے باندھ دو اور بندھوا کر پیٹنے لگا۔ جبریہ نے شور مچایا۔ مالک نے کہا "کیوں چیختا ہے؟ خدا کا بندہ، خدا کے ڈنڈے سے، خدا کی رسّی میں، خدا کے حکم سے تجھے پیٹ

رہا ہے تو اسی سے کہہ کہ مجھے کیوں پٹوا رہا ہے؟" تب اس شخص نے جبریہ عقیدہ سے توبہ کی۔

۴۔ معتزلہ:- یہ واصل بن عطا کے پیرو ہیں۔ اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ایک دن خواجہ حسن بصری نے مرجیہ اور خارجی عقائد پر سوالات کے جوابات دیئے اس دوران انہی کا ایک شاگرد "واصل بن عطا" نے کھڑے ہو کر کہا:

"میرے عقیدہ میں گناہ کبیرہ کرنے والا نہ "کافر مطلق" ہے نہ "مومن مطلق" ہے بلکہ کفر و ایمان کے درمیان مقام رکھتا ہے" جس پر انہوں نے کھڑے ہو کر آواز دی سے "واصل نے مجھ سے علیحدگی (عزلت) اختیار کی۔ اسی مناسبت (عزلت) سے یہ لوگ "معتزلہ کہلائے۔ انہوں نے پہلے پانچ عقائد مقرر کئے" جن میں عقیدۂ مذکور بھی ایک ہے جو صریحی طور پر سنت رسولؐ اور نصوص قرآن کی کلی اور اصلی تعلیم کے خلاف ہے۔ اگرچہ اہل سنت کے مشائخ مثل خواجہ حسن بصریؒ نے ابتداء میں ہی ان کو رد کیا لیکن انہوں نے مشہور کر دیا کہ اصل اہل سنت (یعنی سنت کی پیروی کرنے والے) وہی ہیں۔ ان کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ عدل الٰہی میں مصالح و مفاسد سبھی شامل ہیں۔ شیعہ امامیہ اس کو کلی طور پر رد کرتے ہیں۔ مجموعی

طور پر ان کا غالب عقیدہ یہ رہا کہ اللہ کی طرف سے بندہ تفویض کلی کا حامل ہے۔

چنانچہ معتزلہ میں آگے چل کر متعدد گروہ پیدا ہوئے سے واصلیہ ہذیلیہ۔ نظامیہ۔ خابطیہ۔ بشریہ۔ معمریہ۔ مرداریہ۔ ثمامیہ ہشامیہ۔ جاحظیہ۔ خیاطیہ۔ جبائیہ، انہوں نے اصول اسلام سے بعید من پسند خیالات کو اپنے عقیدہ میں داخل کر لیا۔ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے خصوصی طور پر مدینہ میں جو مدرسہ قائم کیا وہاں ایسے خرافات کی بہت حد تک اصلاح ہوئی۔ بنو عباسیہ حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے امت کو تقسیم کرنے کی جو پالیسی روا رکھی اس میں نئے خرافات نے جڑ پکڑ لی اور معتزلہ کے نئے نئے فرقے نمودار ہوتے گئے۔ اگرچہ معروف مذاہب اہل سنت کے مقابلے میں نمایاں نہیں ہیں۔

۵۔ اشعریہ (اشاعرہ) یہ ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری (از اولاد ابوموسیٰ اشعری) کے پیرو تھے جو ۲۶۰ھ میں بمقام بصرہ پیدا ہوا اور ۳۲۴ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

اشاعرہ فقہی مسائل میں مذہب شافعی کے تابع ہیں۔ قرآن کے قدیم ہونے اور خدا کے روز قیامت میں دکھائی دینے کے قائل

ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے اچھے اور بُرے دونوں کام خدا کے ارادہ سے انجام پاتے ہیں۔

مذاہب اربعہ (تفصیل ذیل) جو معروف بہ اہل سنّت والجماعت ہیں، ان کو مذہب شیعہ امامیہ بھی دائرہ اسلام میں شامل سمجھتا ہے، جس طرح یہ چاروں مذاہب شیعہ امامیہ کو دائرہ اسلام میں شامل سمجھتے ہیں۔ جب سے "مذاہب خمسہ" دنیا میں عالمگیر ہوئے۔ نئے مذاہب اور "فکری گروپوں" کو قدم جمانے کا کم موقع ملا۔ مذاہب خمسہ سے مراد اہل سنّت کے چار ائمہ کے مرتبۂ چار مسالک، اور مذہب شیعہ امامیہ ہیں۔ یعنی ــ امام ابوحنیفہؒ سے حنفی فقہ (متعارف ۱۵۰ھ عہد منصور عباسی) امام مالکؒ بن انس سے مالکی مسلک (عہد ہارون رشید عباسی حاکم) امام محمد بن ادریس شافعیؒ سے شافعی مسلک (عہد مامون رشید عباسی)، اور امام احمد بن حنبلؒ سے حنبلی فقہ (تولّد ۱۶۴ھ بغداد وفات ۲۴۱ھ) عہد حکومت معتصم باللہ۔

مذہب شیعہ امامیہ کے عقائد و مسائل کو باضابطہ کتابی تشکل جناب امام جعفر صادقؑ نے (۱۴۸ھ میں) دی۔ اس لئے اس مذہب کے پیروؤں کو "امامیہ" کے علاوہ "جعفری" بھی کہتے ہیں۔ لیکن اصل اور مناسب نام "امامیہ" ہے، جس میں بارہ اماموں کی رہبریت کا

احاطہ سامنے آتا ہے جن کا قائم یعنی امام مہدیؑ غیبت سے اللہ کے حکم پر ظہور فرمائیں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے اور اسلام کی احیاء فرمائیں گے۔ چنانچہ احادیث و اعتقاد کی رُو سے تمام مسلمانوں کو امام مہدیؑ کا انتظار رہتا ہے اور مجموعاً "ظہور مہدی" پر عقیدہ ہے۔ اہل سنّت کا اعتقاد بھی یہی ہے بجز اس کے کہ وہ پیدا ہو چکے ہیں۔ اور غیبت میں ہیں، شیعہ امامیہ کا اعتقاد ہے کہ وہ پیدا ہو چکے ہیں لیکن غیبت میں ہیں اور حکم خدا ملنے پر ظاہر ہوں گے۔ ان کی پہچان کے معیار شیعہ و سنّی روایات میں (کم و بیش) مشترک ہیں۔

مسلمانوں کے مذاہب خمسہ:۔ سنّی حنفیؒ، سنّی مالکیؒ، سنّی شافعیؒ، سنّی حنبلیؒ اور شیعہ امامیہؒ یہ سب بہائی مذہب اور مرزائی (قادیانی) مذہب کو ردّ کرتے ہیں۔ گذشتہ ۱۵۰ برس کے دوران یہ مذاہب ایران اور ہندوستان میں ظاہر ہوئے۔ بہائی نے تشیع کو پہلے سپر بنایا اور مرزائی نے تسنن کو سپر بنایا۔ بہائی مذہب کا بانی مرزا حسین بہاؤاللہ تھا اور مرزائی مذہب کا بانی مرزا غلام احمد قادیانی تھا۔ دونوں فرقے بعض بنیادی عقائد میں تحریف کرتے ہیں۔ بہاؤاللہ نے پہلے 'مہدی' ہونے کا دعویٰ کیا پھر قرآن کی آیات کو بدل دینے

کا دعویٰ کیا۔ اس مذہب کی اصل ابتداء شیخیہ فرقہ (بانی شیخ احمد حسائی، جس نے امام مہدیؑ کا دعویٰ کر کے انحراف پھیلایا تھا) کے ایک فرد سید علی محمد نے 'باب اللہ' ہونے کا دعویٰ کر کے (۵ جمادی الاول ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء) کو بمقام کوفہ کی پھر اس کے پیرو بہاؤاللہ نے آگے بہائی مذہب کی بنیاد ایران میں ڈالی۔ ایران کے شیعہ امامیہ علماء نے اس مذہب کے خلاف (قاچار دور میں) تحریک چلائی، آج دنیا کے بیشتر حصوں میں اسلام مخالف طاقتوں کے بل پر، بہائی لوگ نیا مشن بڑھا رہے ہیں۔ لیکن ایران میں اب نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مرزائیوں کو بھی بعض انحرافی عقائد خصوصاً رسول اکرم صلعم کو آخری نبیؐ نہ ماننے یعنی ختم نبوت سے انکار ہونے کی بناء پر شیعہ امامیہ اور اہل سنت والجماعت ہر دونوں نے رد کیا۔ مسلمانوں میں 'اہل حدیث' کے نام سے یا 'سلفیہ' نام سے جو نئی تحریکیں منظم ہو چکی ہیں، وہ اصولی طور پہ نئی نہیں ہیں البتہ وہ اجتہاد کے قائل نہیں ہیں، بلکہ براہ راست قرآن و حدیث کے حکم کے مطابق ہر ایک کے لئے عمل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں لیکن فعلاً زیادہ تر شافعی مسلک اور چند امور میں حنبلی مسلک کے استنباط سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس طرح عملاً اور عموماً مقلدین ہیں۔ چونکہ زمانہ کا فاصلہ

بہت بڑھ چکا ہے، مسائل نئے پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ ابتدائی صدی کے مسلمانوں میں معروف سنت سے براہ راست استفادہ اور تطابق آسان تھا، اب بہت مشکل ہے اور تمام حدیثوں پر اعتبار ممکن نہیں ہے۔ اس لئے علم و اجتہاد حکم خدا جان لینے کے لئے لازم آتا ہے۔ اس صورت حال میں ان کے لئے بہت سے امور میں مذاہب اربعہ کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک کڑی نجد کے محمد بن عبدالوہاب سے ملتی ہے، جنہوں نے 'اصلاحات' کے نام سے بعض خطوط اور حدود کو متعین کیا جو "وہابیت" کے نام سے مشہور ہوئی۔ سعودی عربیہ کے سعودی اقتدار کے ذریعے بیسوی صدی کی تیسری دہائی سے اس کو بہت ترقی ہوئی۔

اہل سنت والجماعت میں اجتہاد کا دروازہ بند تو نہیں لیکن شیعہ امامیہ کی طرح منظم اور متواتر بھی نہیں ہے جس کی ضرورت ہر ذی حس و دردمند مسلم محسوس کرتا ہے کہ اہل سنت والجماعت (ائمہ اربعہ) میں اجتہادی مرکزیت کو مجتمع کیا جانا چاہئے اس سے بہت سی آپسی غلط فہمیاں بھی دور ہو سکتی ہیں اور اصلاحی نظم کو معروف عقائد و مسائل پر متوازن مؤثر رکھنے میں مدد مل سکتی ہے، ورنہ خسران اور انتشار کا امت کو سامنا رہتا ہے۔

اس کتاب کے عنوان کی نسبت سے 'مذہب شیعہ امامیہ' کا تعارف دیگر معروف مذاہب اسلامی پر کسی تنقید و تبصرہ سے ہٹ کر، مثبت انداز میں کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس لئے کہ اس مذہب کے بارے میں متعدد غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جو بعض علماءِ سوء کے منفی رول کی وجہ سے خود مذہب امامیہ کے بعض حلقوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کی اصلاح ضروری ہے۔ حالانکہ دنیا میں سب سے زیادہ منظم، مدوّن اور مجتمع "مذہب شیعہ امامیہ" ہے جس کی نشاندہی اصول و فروع میں 'اعلم زمانہ' کے عملیہ (توضیح المسائل) سے ہوتی ہے۔ اس لئے رفع شکوک و جہالات کا بہترین وسیلہ اور ذریعہ عملیہ اصول و احکام کا مطالعہ ہے، جو عقائد و مسائل شیعہ امامیہ کا اجمال پیش کرتا ہے۔

شیعہ امامیہ مذہب کے اساسی اصول :-

شیعہ و سنّی توحید میں نبوت اور آخرت کے عقائد ایک جیسے ہیں۔ لیکن عدل اور امامت میں مختلف ہیں۔ شیعہ امامیہ میں اصول دین بنیادی طور پانچ ہیں ۔ توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت۔ شیعہ ان سب کو مسلمان سمجھتے ہیں جو توحید،

نبوت اور آخرت میں اسی طرح یقین رکھتے ہوں جس طرح قرآن و سنّت کا مقصود ہے۔ اس رو سے شیعہ ائمہ اربعہ اہل سنت کے کے مذاہب کو دائرہ اسلام کے اندر قرار دیتے ہیں اور 'شیعہ و سنّی' نام سے جو منحرف فرقے نمودار ہوتے رہے ہیں ان کو رد کرتے ہیں۔

۱ ـــــ شیعہ امامیہ کا موقف اُلوہیت و توحید کے بارے میں واضح ہے جس کی رو سے اللہ کے صفات ثبوتیہ آٹھ ہیں ۔ قدیم، قادر، عالم، حی، مُرید، مدرک (مثلاً کان کے بغیر سننے والا، آنکھ کے بغیر دیکھنے والا، وغیرہ) متکلم اور صادق۔ صفات سلبیہ یہ ہیں :۔ کوئی شریک نہیں، مرکّب نہیں، جسم نہیں، آنکھوں سے دکھائی دینے والا نہیں، محتاج نہیں، محل حوادث نہیں، تغیّر اور جسمانی عوارض نہیں رکھتا، کسی میں حلول نہیں کرتا۔

۲ ـــــ 'عدل' کا عقیدہ شیعیت کی بنیاد میں سے ہے جو عقیدہ توحید کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ شیعہ امامیہ خدا کی ذات کو اس کی صفت سے الگ نہیں مانتا بلکہ اس کا اعتقاد ہے خدا خود بالذات عادل ہے، عدل کرتا ہے، اس کا ارادہ عدل ہی ہوتا ہے۔ وہ ظلم کبھی نہیں کرتا۔ کیونکہ ظلم خود ذات الٰہی کے برعکس ہے، اور ذاتِ الٰہی نہیں ہے۔ ذات خدا ہر چیز میں ہے لیکن ملی ہوئی نہیں ہے۔

۳ ـــــ شیعہ امامیہ "قرآن مجید" جو موجودہ صورت میں

مسلمانوں کے درمیان موجود ہے' میں مکمّل ایمان رکھتا ہے۔ اگرچہ اس کو جمع کرانے کا کام اجتماعی طور پر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں ہوا لیکن اس کی حفاظت کا اصلی انتظام حضرت علیؑ اور اہل بیتؑ کے وابستگان نے کیا تھا۔

۴ ـــــــ شیعہ امامیہ کا اعتقاد ہے کہ مجموعی طور پر صحابہ کرامؓ نے بڑی محنت اور قربانی سے دینِ اسلام کو آنحضورؐ کے زمانۂ حیات میں خصوصی طور اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں بہت حد تک پھیلایا اور رائج کیا لیکن اس سلسلے میں ہمیشہ حضرت علیؑ کے گھرانے نے انتہائی زیادہ قربانیاں دیں اور دورِ خلافت کے بعد ائمّہ طاہرینؑ نے اس کو محفوظ رکھنے میں اہم ترین حصّہ ادا کیا۔ قرآن و حدیث میں اہل بیت رسولؐ (پنجتن پاکؑ) اور باقی ائمہ سلسلۂ اہل بیتؑ کا مرتبہ سمجھایا گیا ہے۔ شیعہ آنحضور پیغمبر اکرم صلعم کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت علیؑ سے لیکر امام مہدیؑ تک بارہ اماموں کی عصمت و طہارت کے قائل ہیں اور ان کا اعتقاد ہے کہ آنحضور صلعم کے بعد تمام انسانوں میں حضرت علیؑ ہی افضل تھے۔

۵ ـــــــ شیعہ وسالت' ولایت اور شفاعت کے قائل ہیں پیغمبر اکرم صلعم کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ اور بارہ اماموں کو دعاؤں کی اجابت اور شفاعت و مغفرت کا وسیلہ مانتے ہیں۔ نصوص قرآن

اور متواتر' مستند' معتبر احادیث کی رو سے اُن کے پاس اس کے حق میں محکم دلائل ہیں۔ (مثلاً آیہ تطہیر۔ الاحزاب ۳۳' آیہ مباہلہ۔ آل عمران ۶۱' آیہ مودّت۔ شوریٰ ۲۳' آیہ ولایت۔ مائدہ ۔۔ ۵۵' آیہ اطاعت اولوالامر۔ نساء ۵۹' آیۂ وسالت المائدۃ ۳۵' آیہ استعانت۔ تحریم ۴' نیز سورہ بقرہ آیت ۳۰' سورہ توبہ آیت ۱۰۵ وغیرہ)

۶ ـــــــ شیعہ معرفت و شریعت کو ایک دوسرے سے جداگانہ نہیں سمجھتے ہیں اور اس کی مثال رسول اللہ صلعم اور ائمہ طاہرینؑ کی حیاتِ طیبّہ سے دیتے ہیں۔ جو روحانی و عرفانی کمالات و معجزات اور اخلاقیات میں لامثال تھے اور ان کا اعتقاد ہے کہ جو حدود شریعت کو پھاند کر صوفی ہونے کا دعوٰی کرتا ہے وہ منحرف ہے۔ البتہ شریعت مقدسہ کے راستہ پر معرفت الٰہی کے اسرار کو درک کرنے کا راستہ وہ خاص توسّل و طریقہ ہے جو کردار سے منکشف ہوتا ہے اور جیسے ائمہ طاہرینؑ جو راسخون فی العلم تھے اور بابُ العلم حضرت علیؑ کے واسطہ سے مدینۃُ العلم حضور اکرم صلعم سے علوم ظاہری و باطنی کے حامل تھے' نے دکھایا ہے اور جس کا سمجھنا اور پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

خلافت و امامت :۔

۷ ـــــــ مذہب شیعہ امامیہ' حضرت علی علیہ السلام کو آنحضور صلعم

کا خلیفہ اور بلا فصل وصی سمجھتا ہے، اور حق خلافت "امام اوّل" کی حیثیت سے انہی کا حق مانتا ہے۔ جس کے لئے دلائل و شواہد پیش کرتا ہے، لیکن اس کو کسی اختلاف عامہ کی بنیاد نہیں قرار دیتا ہے، جس طرح حضرت علیؑ نے خلافت ظاہری (حکومت) بلا فصل نہ ملنے پر دعوائے حق تو کیا لیکن، تفرقہ بین المسلمین کو ٹالنے کے لئے اتمام حجت کے بعد، صبر و ثبات کے ساتھ خاموشی اختیار فرمائی بلکہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ان کے دور خلافت میں کئی امور میں معاونت و تعاون سے نوازا اور اکابر صحابہ و خلفاء بھی ان سے علمی، اعتقادی، استفتائی (Judicial) اور سیاسی و نظمی معاملات میں رجوع کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کئی بار حضرت عمرؓ نے کہا: لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ۔ حضرت علیؑ کی مداخلت و مشاورت سے متعدد مسائل حل ہوئے لیکن بعض معاملات ایسے بھی ہوتے تھے جن پر آپ نے سخت اعتراض بھی کیا، جیسے زکوٰۃ کے معاملہ پر مالک بن نویرہ کے قتل اور اس کی بیوی کی عصمت دری پر خالد بن ولید (سپہ سالار) کو قتل کی سزا دینے پر آپ نے تاکید کی لیکن اس کے مطابق عمل نہ ہوا بہت خفیف سزا دی گئی حالانکہ یہ اپنی نوعیت کا سنگین ترین جرم تھا۔

حضرت علیؑ نے حضرت عثمانؓ کو بھی بہت مشورے دئے جن

سے نظم امت کو استوار رکھا جا سکتا تھا لیکن مروان اور بنو امیہ کے دوسرے عمال اور منفی عناصر کی سازشوں سے ان پر عموماً عمل نہ ہوا۔ جن سے حالات بگڑے اور جن کا بھرپور فائدہ معاویہ بن ابی سفیان نے بنی امیہ کا ملوکانہ اقتدار قائم کرنے کے لئے اٹھایا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے قتل کئے جانے کے بعد جب لوگوں کی اکثریت نے حضرت علیؑ سے خلافت (حکومت اسلامی کی منصب داری) قبول کرنے پر اصرار کیا تو قرآن و سنت کے مطابق حکومتی سطح پر اصلاحات نافذ کرنے کی شرط پر اسے قبول فرمایا۔ چنانچہ بعض صحابہ نے تعاون نہیں دیا اور بعض نے برملا بغاوت کی۔ حضرت علیؑ نے معاویہ بن ابی سفیان کے خلاف علانیہ جنگ کو لازم قرار دیا اور منافقت کی سرکوبی کی بھرپور کوشش فرمائی۔ لیکن حالات بہت بگڑ چکے تھے اور خلافت کا جو تجربہ کئی مراحل طے کر چکا تھا، اب سازشوں اور فریبوں سے مجروح ہو گیا تھا۔

شیعہ امامیہ حق خلافت کا مرکزی عامل "غدیر خم" میں حجۃ الوداع سے واپسی کے دوران ایک لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کے مجمع میں نبی اکرمؐ کے اعلانِ ولایت کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔ یعنی (جس کا میں مولا ہوں، یہ علی اس کا مولا ہے) اور اس کے ساتھ بہت سے نصوص قرآن و حدیث۔

چنانچہ اس حدیث کے تواتر کو اس مناسبت سے بھی ثابت کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے اپنے زمانۂ خلافت میں رحبہ کے مقام پر لوگوں کے جمع غفیر میں واقعہ غدیر کی یاد دلائی۔ آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

"میں ہر مرد مسلمان کو قسم دیتا ہوں کہ جس نے غدیر خم میں اپنے کانوں سے رسولؐ کو اعلان فرماتے سنا ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہو، جو کچھ سنا تھا اس کی گواہی دے۔"

چنانچہ اس مجلس سے تیس۳۰ صحابی کھڑے ہوئے جن میں بارہ ایسے تھے جو جنگ بدر میں شریک ہو چکے تھے۔ ان سب نے غدیر کی گواہی دی، لیکن حارث نے گواہی نہ دی، حضرت علیؑ کے یاد دلانے پر بھی حیلہ سے کام لیا تب آپؑ کی بد دعا سے موقعہ پر ہی برص کی بیماری میں مبتلا ہوا۔ یہ تاریخ میں "واقعہ رحبہ" سے مشہور ہے۔

خلافت اور امامت کے معنی مختلف نہیں ہیں، البتہ آنحضور صلعم کے بعد خلافت ظاہری میں جب فصل پیدا ہوئی، یعنی ایسے حالات پیدا ہوئے کہ حضرت علیؑ کو خلافت نہ ملی تو خلافت اور امامت کی اصطلاحیں متعین مقامات پر ابھرنے لگیں۔ امامت اس کی محتاج نہیں کہ ظاہراً حکومت، خلافت اس کا خاصہ بن جائے۔ امام خلیفہ ہوتا ہے۔ چاہے اقتدار حکومت اس کے ہاتھ ہو یا نہ ہو۔

امامت کے بھی دو پہلو ہیں۔ معنوی اور منصبی۔ معنوی سے مراد امامت کے اصول اور خطوط ہیں، جن کو رائج کرنا مقصود ہوتا ہے، اور جو حکومت اسلامی کے لئے اہم ہوتے ہیں۔ منصبی امامت کا کسی شخص کے ساتھ مختص ہونے کی صورت کو ظاہر کرتا ہے یعنی حضرت علیؑ بحیثیت امام اوّل، حضرت امام حسنؑ بحیثیت امام دوم وغیرہ چنانچہ حضرت امام حسنؑ نے جب مسلمانوں کے اندر پھیلی خارجی اور داخلی سازشوں کے جال کو دیکھا، تو اقتدار خلافت (حکومت) کے لئے جنگ کے اثرات اور نتائج پر نظر کی جو صریحی طور پر اسلام کے تمام اصول و قواعد کو مجروح کر ڈالتے انہوں نے "معنوی امامت" کے تحفظ کو "منصبی امامت" پر ترجیح دی۔ یعنی معاہدہ صلح میں دوسرے شرائط کے علاوہ یہ شرط لگادی کہ "معاویہ بن ابی سفیان قرآن و سنت کے مطابق حکومت کرے گا اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد قرار نہیں دے گا۔" اس طرح انہوں نے نہ تو معاویہ کو امام تسلیم کیا نہ خطِ امامت کو مجروح ہونے دیا۔ امامت کبھی حکومت ظاہری کے طور پر بھی سامنے آتی ہے جیسے حضرت علیؑ چوتھے خلیفہ اور امام رضاؑ کی خلافت ظاہری (عہد مامون)۔ چنانچہ امام رضاؑ نے جب رائج حکومت کے شاہی طریقوں کو بدل کر خلافت اسلامی کے طریقوں کو پھر رائج کرلیا تو ان کو زہر سے شہید کروادیا گیا۔

المیہ ۴:- المیہ یہ نہیں کہ "مسئلہ خلافت" پر امت میں اختلاف کیوں ہے؟ ایک طرف "اجماع جمہور صحابہ" کا ظہور ہے، دوسری جانب واضح نصوصِ حق خلافت کے دلائل ہیں اور صحابہ کی ایک جماعت جو "شیعانِ علیؑ" کے نام سے مشہور ہوئی کا تواتر ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر اختلاف رائے کا ہونا کوئی عنقائی امر نہیں ہوسکتا بلکہ امکانی امر ہے۔ یعنی اختلاف، پیدا ہونے کی گنجائش موجود ہے، جو چیز نہیں ہونی چاہئے تھی لیکن جب ظاہر ہوئی تو "اختلاف" کا ازالہ معمولی بات نہیں ہوسکتی۔ اصل المیہ یہ ہے کہ اُس 'اختلاف' کو بنیاد بنا کر تحریر و تقریر میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا۔ غلو اور تکفیر کا آپس میں جال بچھا دیا گیا۔ شبہات و خدشات پر اکڑنے کے لئے اصولِ اخلاق کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ فاصلوں کو پاٹنے کے بجائے قبلیت کا معیار، خلیج وسیع تر کرنے کو سمجھا جاتا رہا۔ سنیوں کی اجتماعی سطح پر اس طرح "انحراف" کا رنگ پھیلانے کی کوشش کی گئی جو شیعوں میں ان کو مرکز اسلام سے دور سمجھنے کا تاثر پیدا کرتا ہے، اس طرح شیعوں کی اجتماعی سطح پر ایسے "غلو" کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی جاتی رہی جو سنیوں میں ان کو اساسِ اسلام سے الگ کر دینے کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ اجتماعاً سنیوں کے سارے متعارف گروپ منحرف ہوئے

ہیں نہ انفرادی طور پر سارے سنی "مسلمان" "سنی العقیدہ" ہیں۔ اسی طرح نہ اجتماعاً شیعوں کے سارے متعارف گروپ منحرف ہوئے ہیں نہ انفرادی طور پر سارے شیعہ "مسلمان" "امامیہ" ہیں حتّٰی کہ "تشیع" کی اساس پر بھی سب مجتمع نہیں ہے۔ "تشیع کی اساس" سے مراد ہے ۔ آنحضور رسول اکرمؐ کے بعد اہل بیتؑ پنج تن پاکؑ کو تمام مسلمانوں سے افضل و اشرف سمجھنا اور ان کی اتّباع کو مقدّم جاننا۔ اگرچہ تمام مسلمان مجموعی طور پر کُلی یا جُزوی طور، کسی نہ کسی طرح، اس فضل و شرف کا اقرار کرتے ہیں لیکن "اہل سنّت والجماعت" نے اس کو مرکزی طور پر عمومی عقیدہ کی "صورت" نہیں دی ہے۔ ہاں! شیعہ نام کے تمام فرقوں نے اس کو مجتمع طور پر اساس بنایا، بلکہ آیت تطہیر اور آیت مباہلہ کے شان نزول میں جو احادیث بین المسالک روایت سے متفقاً ثابت ہیں ان نصوص کی بناء پر پنج تن پاک کی "عصمت" کے معتقد بھی ہیں۔ اسماعیلیہ، زیدیہ وغیرہ اس عصمتی سلسلہ کو کچھ کچھ آگے بھی بڑھاتے ہیں لیکن دوسروں اور شیعہ امامیہ میں یہ فرق ہے کہ وہ اس سلسلے میں نہ افراط سے کام لیتے ہیں نہ تفریط سے بلکہ واضح طور پر اس عصمتی سلسلہ کو آنحضور صلعم کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ اور (حضرت علیؑ سے امام مہدیؑ) بارہ اماموں تک محدود سمجھتے ہیں۔ تاریخ میں کسی کو مسلمانوں کے علماء و مشائخ

کو ان بارہ اماموں کے بارے میں یہ تامل وتردد نہیں کہ وہ اپنے اپنے زمانوں کے انتہائی پاکباز اور تبحر علم وتعقل وفضیلت میں یکتا تھے۔

مذکورہ "اساس" کے علاوہ بعض فرقوں اور گروہوں نے جو شیعہ نام پر ظاہر ہوئے اس قدر اس سلسلے میں غلو کیا کہ حضرت علیؑ کو کہیں رسول سمجھا گیا، کہیں خدا۔ مُصلحین ومجتہدین شیعہ امامیہ کا نکتہ نظر یہ بھی ہے کہ "غالی" اسلام دشمن سازشوں کی اندرونی اور بیرونی ریشہ دوانیوں کے ایجنٹ تھے۔ شیعہ امامیہ نے ان تمام انحرافات کو ردّ کرکے ایسے گروہوں اور ایسے اعتقادات کو خارج از اسلام قرار دیا۔

سنّی وشیعہ ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے ہیں کہ وہ "قدح صحابہ" اور "مدح صحابہ" کے نام سے غلو کرتے ہیں، حدود کو پھاندتے ہیں۔ یقیناً دونوں طرف ایسا ہوا ہے، لیکن اس کو "شیعہ امامیہ" اور "اہل سنّت" کا عمومی عقیدہ وطریقہ قرار دینا درست نہیں ہے۔ قدح صحابہ ایک عنوان مطرح ہوا ہے جو شیعہ امامیہ کے یہاں کوئی مذہبی اساس اور موضوع نہیں ہے، لیکن صحابہ کی غلطی پر پردہ کرنا نہ واجبی امر ہے نہ اس سے مسئلہ اختلاف رفع ہو سکتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں یقیناً اسلامی وانسانی شرافت وادب کے حدود کو پھاندنا سیرت معصومینؑ کے خلاف ہے جس کا بجا طور پر بعض واعظین اور مصنّفین تاریخ میں چل رہی زیادتیوں سے متأثر

ہو کر مرتکب ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ "شیعہ" سے منسوب بعض کتب میں حضرت عائشہؓ کی تضحیک اور ان کے بارے میں نازیبا الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے اور بدقسمتی سے ان سب کو "شیعہ امامیہ مذہب" کے سر تھوپ دیا گیا ہے یا لکھنے والوں نے اس کا سہارا لیا ہے۔ صحابہ میں منافقین بھی تھے اور علانیہ طور پر ظلم وتشدد میں کمال کرنے والے، وعدوں اور عہدوں اور جادۂ شریعت سے بغاوت کرنے والے بھی جیسے معاویہ، عمر بن العاص وغیرہ جنہوں نے ایسی حدیثوں کو بھی گڑھ لیا جو نصوص اسلام سے بعید ہیں اور اسلامی خلافت کی اساس جس نے بعض نظمی مراحل کا تجربہ کیا تھا، کو اپنے غلط غیر اسلامی کردار سے ڈھا دیا۔ مثلاً آج مسلمان جب تک "جنگ صفین" میں علیؑ اور معاویہ کے درمیان فیصلہ کن نظریہ کا حامل نہیں ہو جاتا ہے دنیائے اسلام میں کوئی تحریک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہی نہیں ہو سکتی۔ اس بارے میں مغالطے نے ہر چیز ہر بات، ہر اقدام بیک وقت صحیح بھی معلوم ہوتا ہے غلط بھی، جائز بھی ناجائز بھی۔ جدوجہد میں مرنے والا مسلمان شہید بھی قرار دیا جاتا ہے مردود بھی۔ یہ ساری خرابیاں اُسی زمانہ کی پیداوار ہیں۔ جس کے تواتر میں روز عاشوراء یزیدی فوج کے سپہ سالار عمر بن سعد نے اعلان کیا۔ "حسینؑ کو جلدی قتل کرو، نماز میں دیر ہو رہی ہے"

غلو کرنے اور اساسی عقائدِ اسلامی کو مجروح کرنے میں 'سنّی' تمام پر ایسے معتقوں اور خطیبوں کی کمی نہیں جو یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ معاذ اللہ" حسینؑ باغی تھے اور یزید لعہ امیر المومنین تھا!"— حالانکہ یہ عقیدہ شیعہ و سنّی اساس کے خلاف ہے۔ اگر کوئی سُنّی اسلام کے بنیادی عقائد، معروف احکامِ شریعت نیز خود اپنے مذہب مسلک کے مرتبہ مسائل و قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ 'سُنّی' مذہب ہی ایسا ہے، اگر کوئی شیعہ ایسا کرتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ 'شیعہ امامیہ' (جو آج دنیا کا معروف ترین شیعہ مسلک ہے) ہی ایسے ہیں۔ اصلاح باہمی کی بجائے ہم انتشار کو زیادہ ہوا دینے کے موقعہ و محل کی تلاش میں رہتے ہیں۔

محرکات وعوامل :- (مذہبِ شیعہ امامیہ کے اساسی خطوط)

ا ـــــــ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ائمہ طاہرینؑ کے تجربے استفادہ کا بین الاقوامی صحنۂ استفادہ محدود ہو کر رہ گیا۔ جن الٰہی حکمتوں اور اخلاقی عظمتوں سے ان کا قول و فعل مزیّن تھا، اسے ایک فرقہ یا کئی چند فکری حلقوں تک محدود کر لیا گیا اکثر مسلمان ان سے بہرہ مند نہ ہو سکے۔ شیعہ اسلامی فرقوں میں علماءِ سوء کے طبقہ نے اس صحنۂ استفادۂ عمومی کو سمیٹ کر اپنی

مُریدی میں محدود کر دیا، اس کا اثر سیاسی نشیب و فراز اور اکثر مسلم حکمرانوں کی استحصالی کارگزاریوں کے باعث، ان اصلاحی و تبلیغاتی اقدامات کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی رہا، جن کو بڑی قربانیوں کے ساتھ جیّد اور متقی علماءِ شیعہ امامیہ نے صادر کیا۔ البتہ شیعہ امامیہ میں اجتہادی سلسلہ عالمگیر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ احساس نمایاں طور اُجاگر ہوتا گیا۔ ائمہ طاہرینؑ نے تفسیر و حدیث کے اصول و پیمانوں کے خطوط واضح کئے۔ کلام و نحو کے آداب سکھائے۔ علم رجال کو شرعی تحقیق کا پیراہن پہنایا۔ طب، ہیئت، فلکیات، کیمیا کے انکشاف کئے۔ فقہ اسلامی کو مدوّن کیا اور دوسرے علماء کو متوجہ کیا۔ قرآن کو محفوظ کرنے اور حدیث کو معیار پر پرکھنے کی حِس اجاگر کی۔ اُن سے دشمنی کے باوجود بنو اُمیّہ و بنو عبّاسیہ حکمرانوں کو مسلمانوں کی عمومی فلاح اور مفادِ عامہ کے لئے اقتصاد و سیاست کے استحکام کیلئے مشورے دئے۔ دہریوں، یونانی فلسفیوں، تحریف کرنے والے عیسائیوں، مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے والے یہودیوں سے بحث و مناظرہ کر کے ان کو شکست دی۔ فلسفہ کو توہّم سے نکال کر علم کے راستہ پر لگا دیا، منطق کے اصول نمایاں کئے۔ زبان و ادب کو زینت دی، علماء کو عزت دی، محققین کی حوصلہ افزائی کی۔ عرفان کو غیر مشروع شیطانی کرتبوں کے حملوں سے بچایا۔ وقت

وقت پر اپنے گھر بار کو راہِ اسلام میں لٹایا۔ کربلا برپا ہوا تو ثابت قدم رہے، دیوار بغداد میں عباسی ظالم حکمران نے سادات کی اولاد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر چنوا دیا تو صبر کیا۔ معاویہ بن ابی سفیان سے لیکر معتمد عباسی تک ہر قسم کے ظلم و تشدد کے خلاف سینہ سپر ہو کر صلح و فقہ سے اُمت کو ثبات کا سلیقہ سکھایا۔ اپنے خاموش کردار میں اخلاق کو زبان دی، انسانیت کو بول دیئے۔ افکار کو تحقیق دی اور حقائق کو توثیق عطا کی۔ اپنے ایثار سے ظالم کو شرما دیا۔ اپنی سخاوت و مروت سے فاسد و فاجر کو جھنجھوڑ دیا، اپنے برتاؤ سے انبیاء کی یاد تازہ کی اور اپنے خُلق سے رسول اکرمؐ کی سیرت کو اُجاگر کر دیا۔ ہر امام اسلام کے لئے زندہ رہا اور اللہ کی راہ میں شہید ہوا۔ ان کا اٹھنا آیات الٰہی کی تفسیر تھا، ان کا بیٹھنا الٰہی علامتوں کی تشریح تھی۔ خود شمع کی طرح پگھلتے رہے اور انسانیت کی روشنی پھیلاتے رہے۔ وہ دنیا میں انسان کامل تھے۔

۲ ——— شیعہ امامیہ، قانون شریعت کے لئے 'کتاب' اور 'سنت' کو دو اہم ماخذ و منابع قرار دیتے ہیں۔ کتاب یعنی قرآن جو محکمات و متشابہات پر مشتمل ہے، محکمات میں احکام واضح ہیں متشابہات کے لئے دوسرے نصوص و دلائل کی ضرورت پڑتی ہے۔

لغت میں سنت کے معنی 'طریقہ اور روش' ہے۔ متعدد آیات قرآن الٰہی ہیں، جن میں حکم صریح نہیں بلکہ سنت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ شیعہ کے نزدیک سنت "معصومینؑ" کا قول و فعل ہے، معصومینؑ سے مراد حضرت پیغمبرؐ، بارہ امام (ائمہ طاہرینؑ) اور حضرت فاطمہ زہراؑ ہیں۔ ائمہ معصومینؑ نے کہیں بہ حوالہ پیغمبرؐ قول نقل فرمایا ہے کہیں حوالہ کے بغیر۔ شیعہ امامیہ کے نزدیک اُن کا قول و فعل بھی اُسوۂ رسول صلعم کی طرح "اسلامی سنت" ہی ہے یعنی جو روش انہوں نے اختیار فرمائی، واضح اور محکم ارشاد ہیں اور ارشاد رسولؐ کے علاوہ اس سے وہ احکام روشن ہو جاتے ہیں جو غیر واضح ہیں، متشابہ ہیں، استنباط کے محتاج ہیں۔ شیعہ حدیث معصومؑ کو سند سمجھتے نیز رسول اللہؐ کی جو حدیث ان سے تواتر رکھتی ہے یا ان میں سے ایک سے جو واضح و ثابت ہے۔ چنانچہ اُن اکابر صحابہ و رواۃ سے جو علماء رجال کے نزدیک عادل رہ چکے ہوں، سے بھی جو احادیث آئی ہوں ان سے بھی اصول فقہ کی رُو سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ سند کے اعتبار سے خبر (حدیث) دو قسم کا ہوتا ہے، ۱۔ متواتر ۲۔ واحد۔ متواتر' بھی تین قسموں کا ہوتا ہے ۔ لفظی، معنوی، اجمالی (تفصیلی بحث مقصود نہیں ہے)

شیعہ امامیہ کا دعوٰی ہے کہ سنتِ رسولؐ اصل میں ائمہ طاہرینؑ

کے پاس محفوظ تھا جنہوں نے اس کو وقتاً فوقتاً تعلیم فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حدیث جمع کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اگرچہ اکثریت صحابہ اس کو جمع کرنے کی رائے ظاہر کر چکی تھی۔ (بقول علامہ نقیؒ لکھنؤ ہند) "قرآن کے ساتھ بے توجہی کے خوف نے اس کام سے حضرت عمرؓ کو باز رکھا تھا۔ اگر اس زمانہ میں قرآن کی طرح حدیث رسولؐ کو بھی اجتماعی طور محفوظ کر لیا گیا ہوتا تو اختلاف حدیث نہ رہتا۔" حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کے خلاف اموی ظالم حکمرانوں نے قہر ڈھایا' دوسری طرف متعدد خدا ترس اصحاب کو بھی قتل کر دیا نیز فتنہ و فساد کے بازار میں سرکاری تبلیغات میں سنت رسولؐ کے بارے میں مغالطہ پیدا کر دیا گیا۔ صحیح حدیث کو پانا اور حاصل کرنا مسلم سوسائٹی میں بہت مشکل ہو گیا۔ حالانکہ حضرت علیؑ (زمانہ خلفائے راشدین میں) پکارتے جاتے تھے" قَیِّدُوا الْعِلْمَ فِی الْکِتَابَۃِ۔" "علمی مطالب قلمبند کرو اور قید (تحریر) میں لاؤ" بہرحال انہوں نے اس کام کو انجام دیا۔ اس طرح حدیث پر سب سے پہلی تصنیف حضرت علیؑ کی ہے جو آپ نے حضرت رسولؐ کے ارشاد سے مرتب فرمائی تھی اس کا پتہ صحیح بخاری کے کتاب الفرائض باب اِثم مَن تبرّأ عن موالیہ میں بھی ملتا ہے۔ امامیہ مسلک میں تو اس کا تواتر موجود ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں :-

" ہمارے پاس ایک صحیفہ ہے جس کا طول ستر گز ہے۔ یہ رسولؐ کا املا ہے۔ جس کو علیؑ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ تمام حلال و حرام' اور جن چیزوں کی لوگوں کو ضرورت ہو سکتی ہے' سب اس پر مرقوم ہیں۔" (اصول کافی جلد ۱)

اس صحیفہ کی اہمیت حضرت علیؑ نے اپنے دورِ خلافت کے خطبات میں واضح کی۔ پھر یہ صحیفہ' ائمہ اہل بیتؑ میں محفوظ و متصرف رہا۔ چنانچہ کتب امامیہ میں ہر امامؑ کی طرف سے اس کتاب کو وقتاً فوقتاً ظاہر کرکے اس سے استفادہ کا تواتر ملتا ہے۔

امامیہ کتب حدیث :- (بحوالہ کتاب تدوین حدیث از علامہ سید علی نقی صاحب لکھنؤ)

(۱) ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام شیعی جوامع حدیث میں "کافی" کا درجہ سب سے مقدم مانا گیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی ہر ہر حدیث صحیح السند اور قطعی ہے۔ ہم حدیث کی کسی کتاب کو قرآن مجید کی طرح معصوم اور جرح و تعدیل کے میزانِ اعتبار سے بلند نہیں سمجھتے۔ کافی کا تقدم و شرف اس اعتبار سے ہے کہ اس میں نقل روایات میں بہت ضبط و اتقان سے کام لیا گیا ہے۔ سندیں پوری نقل کی گئی ہیں۔ روایات کے ٹکڑے نہیں کر دئے گئے ہیں۔ روایات میں ایسے تفسیری نوٹ نہیں دئے ہیں۔ جو اصل الفاظ حدیث کے ساتھ مشتبہ

ہوجائیں۔ پوری سندیں نقل کر دینے کا منشا ہی یہ ہے کہ مصنّف نے اپنے اوپر سے ذمہ داری ہٹالی ہے۔ اور ان رواۃ کے حالات و اوصاف کو جانچ لینے کا موقع دیا ہے ...... اس بناء پر ہم کافی کی حدیث آنکھ بند کرکے قبول نہیں کر لیتے ہیں۔ بلکہ استنباط و اجتہاد کے موقع پر "کافی" کی حدیث کی اُسی طرح جانچ کرتے ہیں جس طرح دوسرے کتب حدیث کی۔ 'کافی دور ائمہ کے گزر جانے کے بعد "غیبت" (اعلان غیبت امام مہدیؑ) کے زمانہ میں چھوٹے مسودوں اور متعدد و منتشر کتابوں کے بدل کے طور پر مجتمع ہوئی۔ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینیؒ نے بیس برس کی جفاکشی کے بعد اس کام کو انجام دیا۔ اس میں دو حصے ہیں۔ ایک اصول و عقائد کا، جس کو 'اصول کافی' کہتے ہیں' دوسرا مستقل مسائل اور فروع یعنی مسائل شرعیہ کا' اس کو "فروع کافی" کہتے ہیں۔

(ii) ——— دوسرے بزرگ جنہوں نے اس خدمت کو انجام دیا شیخ صدوق محمد ابن علی ابن بابویہؒ قمی تھے۔ جنہوں نے کتاب من لا یحضرہ الفقیہ لکھی۔ انہوں نے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ میں اس میں وہی روایات درج کروں گا جس کے مطابق میں فتوٰی دیتا ہوں اور اپنے اور خدا کے درمیان ان کو حجت سمجھتا ہوں۔

لیکن بقول مجتہدین حدیث انہوں نے بعض روایتیں ایسی بھی درج کرلی ہیں۔ جن کی ان کو رد کرنا پڑی ہے۔ انہوں نے پوری سندوں کی بجائے آخری راوی کا نام لکھا ہے اور کتاب کے خاتمہ پر مشائخ کی ایک فہرست بھی لکھی ہے جس سے روایت کی جانچ میں مدد ملتی ہے۔

(iii) ——— پانچویں صدی ہجری میں محمد بن الحسن طوسی نے کتاب تہذیب اور کتاب استبصار تصنیف کی۔ اس میں کہیں کافی کی طرح پوری سند ہے تو کہیں "مَن لا یحضرہ الفقیہ" کا طریقہ ہے۔ علماء حدیث و فقہ کافی کو اخلاق و فقہ کے اعتبار سے جامع سمجھتے ہیں۔ لیکن 'تہذیب' کو فقہ کے اعتبار سے زیادہ جامع قرار دیتے ہیں۔ "استبصار" صرف کتاب جامع احادیث ہی نہیں بلکہ اس میں متعارض حدیثیں درج کرکے ان میں جمع' ترجیح یا تاویل کے فرائض انجام دیئے گئے ہیں جو خاص ایک فقیہہ اور مجتہد کا فرض اور اس کی روش ہے۔ شیعہ امامیہ کی یہ چاروں کتابیں "کتب اربعہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کتب میں احادیث کی تعداد اس طرح ہے ـ کافی = ۱۶۰۹۹ ' من لا یحضرہ = ۹۰۴۴ ' تہذیب = ۱۳۵۹۰' استبصار = ۵۵۱۱ احادیث۔

گیارھویں صدی ہجری میں ملّا محسن فیض کاشانیؒ نے مسذکورہ

چاروں کتب جو "الصحاح" کے نام سے مشہور ہوئیں، کے احادیث کا مجموعہ "وافی" کے نام سے تحریر کیا۔ اس میں مشکل احادیث کا حل بھی پیش کیا ہے لیکن جن میں بعض پر علماء حدیث نے آگے نقد و نظر سے کام لیا ہے"۔

شیعہ مذہب کے ایک مشہور محدّث نے "بحار الانوار" کے نام سے متعدد جلدوں پر مشتمل کتاب، مذکورہ چار کتب اور سینکڑوں دوسری کتابوں سے احادیث کو جمع کیا۔ یہ کام اگرچہ علماء شیعہ امامیہ کے نزدیک اس لحاظ سے گراں قدر ہے کہ ایک متلاشی شخص کے لئے روایات کا ذخیرہ ایک جگہ موجود ہے لیکن علماء حدیث کہتے ہیں کہ بحار میں غیر مستند روایات کا ذخیرہ بھی ہے۔ علماء حدیث نے روایات کی جانچ کا کام جاری رکھا۔ چنانچہ شیخ محمد بن حسن العاملی نے صرف فقہ کے متعلق احادیث کی جانچ کر کے کتاب "وسائل شیعہ" مرتب کی۔ جو فقیہہ مجتہد کے لئے کام کی جامع چیز ہے لیکن اس میں بعض قبیل کے احادیث کو ذیلی عناوین کی مناسبت سے ٹکڑے کر کے الگ الگ متعلقہ ابواب میں اپنے اپنے موضوع کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ اب اس پر یہ کام ہو رہا ہے کہ ایک روایت کے مقابلے میں جو مواضع آتے ہیں ان ٹکڑوں کو جمع کر کے حدیث کو یکجا کیا جاتا ہے۔

بہر حال گذشتہ صدی کے دوران حوزہ علمیہ قم اور نجف میں "حدیث" پر بہت کام ہوا اور مواضع کے لحاظ سے روایات کی تقطیع و جانچ کا

سلسلہ و احتیاط و تلاش و تحقیق جاری رہتا ہے۔ اس صدی کے اوائل میں کتاب مستدرک الوسائل بھی ایک مشہور کتاب ہے۔ علم رجال اور علم اصول پر بھی شیعہ امامیہ علماء نے متعدد کتب تصنیف کی ہیں۔ جن کی مدد سے روایات کی جانچ اور طبقہ بندی موضوعی کے کام اور تفقہ و اجتہاد میں مدد ملتی ہے۔ اس بارے میں شیعہ امامیہ تعلّم و تعلیم کا سلسلہ مربوط اور مضبوط ہے۔ البتہ بعض نیم ملّا قسم کے کم سواد واعظین، علماء و فقہاء سے استفادہ کی بجائے بعض اوقات براہ راست ضعیف روایات کا استعمال کر کے مسائل اور شبہات پیدا کر دیتے ہیں، جس کی اصلاح جاری اور ضروری ہے۔ اگرچہ اہل سنّت میں صحاح ستہ نام کی کتب حدیث کی تدوین میں احتیاط و مشقت کے واقعات بھی وارد ہیں لیکن حدیث کی کتابی صورت کو قطعی قرار دینے کی بجائے حدیث کی جانچ کے لئے ایک علمی تحقیقی مرکز کا وجود مفید اور ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ شیعہ امامیہ کے علماء حدیث نے مواضع اور مواقف کے اثبات میں کتب حدیث اہل سنّت سے بھی حوالے دئے ہیں ۔ جیسے سنّی مسلم کی صحاح ستہ ۔ چھ کتب :۔ بخاری، مسلم۔ ابن ماجہ۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ مثلاً حدیث ثقلین کو رواۃ امامیہ کے علاوہ مسلم شریف جلد ۵ سے بھی نقل کیا ہے ۔

مفہوم :۔ "میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ایک کتاب خدا اور (دوسرے) میری عترت اہل بیتؑ۔ جب

تک تم ان سے متمسک رہوگے میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔"

جو حدیث "قرآن وسنّت" پر استدلال کرتی ہے۔اس سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔چنانچہ اجتہاد میں شیعہ امامیہ چار مدارک و منابع کو قرار دیتے ہیں۔جن میں پہلے دو منابع وجوہر ہیں باقی دو معاون ہیں قرآنؑ ۔سنّتؑ ۔عقلؑ ۔اجماعؑ ۔ یہ واضح کیا گیا ہے کہ "سنّت" کے لئے وہ کس مصدر کے قائل ہیں۔اور 'سنّت' سے کس مربوط طریقہ سے استفادہ کرتے ہیں۔

۳ ــــــــ توضیح المسائل میں ہر شخص آسانی سے جان سکتا ہے کہ فقہ میں شیعہ امامیہ کے یہاں کون سے مسائل پانچ بنیادی مدّوں کے تحت آتے ہیں یعنی :۔

واجب :۔ جس کا کرنا ثواب اور نہ کرنا گناہ ہے۔

حرام :۔ جس کا کرنا گناہ اور نہ کرنا ثواب ہے۔

مستحب :۔ جس کا کرنا ثواب ہے اور نہ کرنا گناہ نہیں ہے۔

مکروہ :۔ جس کا نہ کرنا ثواب ہے اور کرنا گناہ نہیں ہے۔

مُباح :۔ جو درج بالا چار مدّوں میں نہ آتا ہو اور جس کا کرنا نہ کرنا گناہ یا ثواب کی ذیل میں نہ آتا ہو۔

سنّت/مستحب افعال واقوال اور اخلاق کے بارے میں امور ومسائل واضح ہیں۔نماز میں سنّتی نمازوں اور واجبی نمازوں کا

واضح تذکرہ ہے۔ واجب نمازیں یہ ہیں ؂

(i) نماز یومیہ کل ۱۷ رکعات (ii) نماز آیات (گرہن، زلزلہ خوف وغیرہ) (iii) نماز میت (iv) نماز واجب طواف کعبہ (v) باپ کی قضا نمازیں بڑے بیٹے پر (vi) جو اجارہ، نذر، قسم یا عہد کے ذریعہ واجب ہوجاتی ہیں۔

نماز جمعہ واجب تخیری ہے جو دو رکعت ہیں، اس کے لئے دو نمازوں کے درمیان فاصلہ اور اہل پیش امام کی شرائط ہیں۔

مستحب/نافلہ نمازیں بہت ہیں۔ان میں نافلہ شب ودو ذ کے لئے تاکید ہے۔ ۸ رکعتیں نافلہ ظہر، ۸ رکعتیں نافلہ عصر (قبل فرض نماز) چار رکعتیں نافلہ مغرب (بعد فرض نماز) اور دو رکعتیں نافلہ عشاء (بیٹھ کر بعد فرض) دو رکعتیں نافلہ صبح (قبل فرض) ہیں۔

نافلہ شب کل گیارہ رکعتیں ؂ آٹھ بہ نیت نافلہ شب، دو بہ نیت شفع ایک رکعت نماز وتر۔سفر میں واجب نمازوں میں قصر اور نافلہ میں سہولت ہے۔

اوقات نماز میں فضیلت کے اوقات (یعنی اولین وقت) اور مشترکہ اوقات کی نشاندہی ہے۔یعنی ظہر وعصر کو جمع بین الصلاتین یعنی ایک ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔اسی طرح نماز مغرب کے بعد، بعد نافلہ مغرب نماز عشاء پڑھی جاسکتی ہے۔ یہ سنّت (طریقہ)

رسول اکرم صلعم اور اولین صحابہ سے بہ روایات شیعہ وسنّی ثابت ہے۔ کہ وہ کبھی مذکورہ دو نمازوں کو ایک ساتھ بھی اور کبھی الگ الگ پڑھتے تھے۔ سنّی مسلمان کہیں عام طور پر کہتے ہیں کہ شیعہ "سنّت" نہیں پڑھتے ہیں۔ جو پڑھا لکھا نہ ہو وہ اس سے یہ تاثر بھی لیتا ہے کہ شیعہ مسلمان چونکہ سنّت نہیں مانتے اس لئے سنّت نہیں پڑھتے اوّل تو اس سے "سنّت" سنّت نمازوں تک محدود ہو جاتا ہے پھر سنّت تو ہر مرحلہ اور ہر مسئلہ میں موجود ہے، تقریباً ہر امر میں واجب کے ساتھ مستحبات بھی ہیں، جو کتاب مسائل میں واضح ہیں۔ شیعہ امامیہ میں بہت سارے علاقوں میں نماز باجماعت کا چلن بہت زیادہ نہیں ہے لیکن بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو (خدانخواستہ) نماز نہ پڑھتے ہوں، بہت ایسے افراد بھی ہیں جو واجب کے ساتھ سنّت نمازیں بھی (یومیہ نافلہ) پڑھتے ہیں۔ کتب ائمہ میں شب جمعہ، شب قدر، شب براءت، عیدین، رمضان المبارک، روز عاشوراء اور دوسرے متبرک ایام کے لئے مخصوص عبادات کا بھی ذکر و طریقہ درج ہے۔ مناجات اور دعائیں ہیں۔ جن میں کوئی جبر نہیں لیکن متوجہ افراد ان اعمال کو بجا لاتے ہیں۔ خصوصاً عیدین، رمضان اور محرم میں۔ جن علاقوں میں علماء اہل، متوجہ اور متقی ہیں، مسجد و جماعت کا اہتمام ہے، جن علاقوں میں علماء ضعیف، کم سواد اور گروہ بندی

کے شکار ہیں، وہاں مسجد و جماعت کی طرف کم توجہ ہے۔ البتہ انقلاب اسلامی کے اثر اور امام خمینیؒ کی قیادت سے عالمی سطح کے تمام مسلمانوں میں بالعموم اور شیعہ مسلمانوں میں بالخصوص ایسی بے توجہی پر قابو پایا جا رہا ہے، ان مساعی، نیز دوسری عصری تحاریک کی مدد سے دنیا کے مختلف ممالک میں اجتماعی نظم کے احساسات بڑھتے جا رہے ہیں۔ تاریخ کا المیہ ہے کہ "شیعہ امامیہ" کو شیعہ نام کے دوسرے بعض گروہوں کے انحراف اور 'سنّی' نام کے متعدد حکمرانوں کے ظلم و تشدد کے نتیجہ میں، اکثر ممالک کے اندر غلط تبلیغات کا شکار بنا دیا گیا۔ ادھر بعض خود پسند اور کم سواد ذاکرین نے اپنی مجالس کو چمکا کر زیادہ رقوم حاصل کرنے کی غرض سے بعض روایات کو اس طرح فنّی لطافتوں کے ساتھ پیش کر دیا کہ گویا "امام حسین علیہ السلام کے ماتم میں گریہ وزاری سے سارے گناہ دُھل جاتے ہیں!" حالانکہ امام حسین علیہ السلام نے اسی لئے قربانی پیش کی تاکہ لوگ باطل ہتھکنڈوں اور بے دینی سے باز رہیں۔ اصل بیداری یہ ہے کہ مسجدیں بھی آباد ہوں، امام باڑے بھی آباد ہوں۔ امام باڑوں میں حسینیؑ انقلاب کا تذکرہ ہو تو مساجد فکر حسینیؑ کا مظہر ہوں۔ یعنی جس امام عالی مقام نے جنگ کی شعلہ ناکیوں اور تشنگی کے عالم میں بھی نماز پڑھی، اور وہ حسینیؑ سپاہی نماز کو مقدم

رکھکر عزائے حسینؑ برپا کرے گا' جو انقلاب فسکر اسلامی' اور مفاہیم حق و باطل کے تقابلہ کے لئے ضروری ہے۔ یہ تأثر بھی مسلمانوں میں عام ہے کہ جماعت و فرادیٰ کی بحث سے قطع نظر' عامۃ الشیعہ نماز کی طرف عموماً راغب ہیں۔ البتہ شیعہ زیادہ تر فرادیٰ ہی پڑھتا ہے۔ اور یہ کہ عامۃ السنّی جمعہ کے علاوہ باقی یومیہ نمازیں بہت کم پڑھتے ہیں۔ یہ دونوں غلط فہمیاں قطعی اور حتمی نوعیت کی نہیں ہیں۔ اس میں ملتوں' ملکوں اور ماحولوں کا اثر غالب ہوتا ہے' کہیں ایک قسم کی لاپرواہی ایک فرقہ میں ہے تو کہیں دوسری قسم کی لاپرواہی دوسرے فرقے میں پائی جاتی ہے۔ بہرحال اصلاح حال ضروری ہے۔ اور اس کے لئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی حدبندی و اختیار بندی فرقوں کے حدود تک متعین نہیں کی جاسکتیں۔ ایک سنّی مبلّغ ہو یا شیعہ امامیہ مبلّغ! روئے خطاب و ترغیب ایسے جوہری امور جیسے نماز' روزہ' حج وغیرہ میں 'مسلمان' کی طرف ہونا چاہیئے۔ ہاں! فقہی مسائل میں ایک دوسرے کے حوالوں سے امر بالمعروف و اصلاح حال کا فریضہ انجام دینا چاہیئے۔ عموماً یہ تاثر تمام مسلمانوں میں پایا جاتا ہے کہ شیعہ امامیہ امام جماعت و جمعہ کے بارے میں بہت محتاط ہوتے ہیں اور سنّی مسلمان اس بارے میں بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ یہ بھی کم و بیش

دونوں کے بارے میں دونوں کی غلط فہمی ہے پیش نماز کے لئے دونوں قریباً ایک ہی قسم کی شرائط رکھتے ہیں۔ البتہ اگرچہ شیعہ عموماً ان شرائط کی طرف متوجہ و محتاط رہتے ہیں لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔ گروہی اثر کے تحت بہتر اور اہل کو نظر انداز بھی کیا جاتا ہے۔ اگر سُنّی عموماً اس مسئلہ کو زیادہ مشکل نہیں سمجھتا لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ نظم اوقاف یا سماجی اثر و رسوخ کبھی اہلیت و نااہلیت پر اثر انداز ہونے والے عوامل ہیں۔ شیعہ امامیہ ہو یا سنّی اربعہ' ان میں واضح طور پر امام جمعہ و جماعات کے لئے شرائط واضح ہیں' مسائل نماز سے واقفیت' عدالت کے (کم و بیش) شرائط' تجوید و قرأت کی صحت وغیرہ شدید ضرورت ہے کہ معروف اداروں کے علماء کی طرف سے جب تک پیش امام کے حق میں سندِ تربیت نہ ہو' اس صورت حال پہ کنٹرول مشکل ہے۔

۴ —— قرآن اور سنّت کے بعد شیعہ امامیہ اجتہاد کے لئے نص نہ ہونے کی بناء پر حسب ضرورت' عقل (یعنی اساس منابع کی رو سے غور و فکر کرنا) اور اجماع کو مدارک جانتے ہیں۔ ان کے یہاں اجماع سے مراد کسی امر میں فقہا کا متفق ہونا ہے۔ لیکن اس بناء پر کہ قول معصومؑ سے مربوط ہو۔ دراصل قرآن اور حدیث ہی اصل منابع ہیں لیکن عقل اور اجماع ان منابع سے حکم کو معلوم

کرنے کے لئے بطور مدارک معاون رول ادا کرتے ہیں۔

بہر حال معصومینؑ کے بعد اجماعِ فقہاء ربانی (عادل) کا اتفاق حجت ہے۔ اجماع علماء ہی مجتہد اعلم (مرجع) کے لئے یعنی اس کی طرف نئے مسائل میں حکم شریعت معلوم کرنے کی خاطر رجوع کرنے کے لئے دلالت بن جاتی ہیں۔

اہل سنّت (ائمہ اربعہ) کے نزدیک اجتہادی قواعد کی رُو سے اجماع کی صورتیں اس طرح ہیں :-

اہل سنّت میں مفہوم اجماع میں اختلاف ہے (i) بعض ارباب حل وعقد کا اجماع صحیح سمجھتے ہیں۔ (ii) بعض امّت کے اجماع کے قائل ہیں۔ (iii) بعض اجماع کو "اتفاق اہل مدینہ" قرار دیتے ہیں۔ (iv) بعض کے نزدیک اجماع، اہل حرمین (مکّہ و مدینہ کے مسلمانوں) کا اجماع ہے۔ اور (v) بعض مصرین (یعنی دو شہروں کوفہ و بصرہ) کے اتفاق کے قائل ہیں۔ مجموعاً ان سارے طریقوں میں سے جو ذریعہ سامنے آئے اور بہ عافیت طے ہو جائے اس پر اعتراض عموماً نہیں ہوتا ہے۔ اکابر فقہاء اہل سنّت نے فقہائے امّت کے اجماع کو زیادہ قرین صحت قرار دیا ہے۔ چنانچہ خلافت کے سلسلے میں خلیفہ اوّل کا انتخاب اجماع کے طریقے سے ہوا۔ اگرچہ اس اجماع کی صحت پر مسلمانوں کے درمیان اختلاف موجود ہے۔ خلیفۂ دوم کا "نصب" سے اور خلیفۂ سوم کا "شوریٰ" کے ذریعے۔

اماً میں شیعہ امامیہ رسول اللہ صلعم کے ارشادات و گائیڈ لائن کی نص کو ثابت کرتے ہیں۔ یعنی انتخاب، مسئلہ امامت و ائمہ طاہرینؑ من جانب خدا ہے جس کی خبر رسول اللہؐ نے دی ہے اور اُن کے اسماء مبارک بھی بیان فرمائے ہیں۔ جو مسلمانوں کی کتب احادیث میں موجود ہے، جن کی پہلی کڑی اور شرط حضرت علیؑ و حضرت فاطمہؑ کی اولاد سے ہونا ہے۔ دورانِ غیبتِ امام اہل علم، تقویٰ اور صلاحیت کی اساس پر کسی مجتہد کے جامع شرائط ہونے کی تصدیق کرتے ہیں اور شیعہ امامیہ فروعات میں اس مرجع کی تقلید کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

استنباطِ احکام (احکام کو منابع سے نکالنے یعنی جان لینے) میں قیاس اور عقل کے مفاہیم میں سنّی و شیعہ کے درمیان ٹکراو پیدا ہوتا ہے۔ عقلی فیصلہ عقلی قضایا پر مبنی ہوتا ہے، جیسے کسی واجب امر کا مقدمہ عقلاً واجب ہے۔ قیاس سے مراد ہے ذہن کا کسی طرف مرکوز ہو جانا۔ فلسفہ و منطق میں قیاس کی جو صورت ہے وہ اس سے کچھ مختلف ہے جس کا اطلاق تفقہ میں بعض مسالک خصوصاً امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے۔ ائمہ اربعہ اہل سنّت میں شافعی مسلک کے لوگ احکام کو بلا واسطہ قرآن و حدیث سے لیتے ہیں اور شافعی مسلک اختیار کرنے والے جب اس خاص روش پر مجتمع ہو کر جو اس سے حکم سامنے آ رہا ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔ عقلاً وہ بھی مقلد ٹھہرتے

ہیں۔ جبکہ اس طرح براہ راست قرآن و سنّت کی نصوص پر بطور حکم عمل کرنے کی روش اپنانے والے کو اخباری کہا گیا ہے۔ اہلِ تسنن میں یہ اصطلاح "اہلِ حدیث" کے طور پر رائج ہے۔ شیعہ امامیہ میں تقلید اور اجتہاد تھیوری اور عمل میں رائج ہے۔ مجتہدین کی ایک چھوٹی تعداد ایسی ہے جو ان دو منابع سے خود حکم جاننے کے متحمل ہو سکتے ہیں، فعلاً عوام و خواص مقلدین ہیں۔

۵۔ تقیہ :۔ تقیہ کا مسئلہ غلط فہمیوں کا مرکز رہا ہے، یہ غلط فہمی عامۃ الشیعہ میں بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ عام سنی مسلمان اس بارے میں شیعوں سے متعلق جو نظریہ قائم کئے ہوئے ہیں وہ اصولاً صحیح نہیں ہے۔ جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے۔ اور فسادات کا سبب ہوتا ہے، تقیہ اس سے مختلف "حکمت" کا نام ہے جس کا استعمال ہر ایک نہیں کر سکتا۔ قرآنی آیت (سورہ آل عمران) میں "اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً" ہے۔ لفظ تَقِيَّةً ہو یا تُقٰىةً معنی دونوں کے ایک ہیں۔ یعنی "بچاؤ کی سبیل کرنا" چنانچہ اسی قبیل کے ایک لفظ تقویٰ کو بھی اس معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جس کا اصطلاحی معنی ہے ۔ "عذاب آخرت، اللہ کی ناراضگی سے بچاؤ کی فکر کرنا۔"

آیت ۲۸ آل عمران کا مفہوم :۔ "اہل حق کو نہیں چاہئے کہ وہ اہل حق کو چھوڑ کر پرستارانِ باطل سے تعلقات محبت و موافقت قائم کریں اور جو ایسا کرے گا اُسے اللہ سے اپنے کو بے تعلق سمجھنا چاہئے ہاں! مگر یہ کہ تمہیں ان سے اپنا بچاؤ کرنا ہو اور بہر حال تمہیں اللہ اپنے سے ڈرتے رہنے کی دعوت دیتا ہے اور باز گشت تو اسی کی طرف ہے۔" (از تفسیر علامہ نقیؒ)

اقتباس از تبصرہ کتابچہ "تقیہ" از مولانا سید علی نقی صاحب مجتہد (لکھنؤ) اگست ۱۹۵۲ء :۔

قانون عام یہ ہے کہ اہل حق اہل باطل کو اپنا دوست نہ بنائیں، ایک ہوتی ہے بشری اعتبار سے معاونت و دوستی۔ دوسری چیز معاشرتی تعلقات اور تمدنی نظام کے لحاظ سے۔ (ملنا جلنا اور کام آنا) جیسے بیماری یا کسی وقت مصیبت میں تیمارداری یا کسی اور طرح کی غمگساری کرنا۔ بھوکے کو کھلانا، پیاسے کو سیراب کرنا گرتے ہوئے کو سنبھال لینا، شخصی خدمات اور ذاتی امور انجام دینا۔ یہ گناہ نہیں ہے، بلکہ اسلام میں متفرق مقامات پر ایسے حقوق انسانی کا پتہ دیا گیا ہے جو مذہب و ملت کی تفریق سے علیحدہ ہیں۔ اس طرح کے خدمات بلا معاوضہ بھی انجام دئے جا سکتے ہیں اور بہ معاوضہ بھی۔ اس طرح کی دوستی اور معاشرتی تعلقات قائم

کرنے میں کوئی ضرر تو نہیں ہے۔ نہ مذکورہ آیات قرآنی کا تعلق ان روابط و تعلقات کے ساتھ ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہم اہل باطل کی پارٹی میں شامل ہوں اور ان کے غلط مقاصد میں ان کے ساتھ اتحاد عمل کریں اور وہ باتیں کریں جن کے لئے ان کے باطل پرستانہ جذبات متقاضی ہوں ـــــ یہ اتحاد عمل، معاونت اور دوستی ہے جسے قرآن کریم نے منع کیا ہے۔ اب جبکہ یہ صورت ہے تو استثناء "اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً" (یعنی) مگر یہ کہ اُن سے بچاؤ کرنا ہو" تو ظاہر ہے کہ یہ استثناء مابعد کے حکم کو ماقبل کے حکم سے الگ کرتا ہے یعنی اگر قبل میں ثبوت ہے تو استثناء کے بعد نفی ہوگی، اگر قبل میں نفی ہے تو اس کے بعد ثبوت ہوگا۔ اس لئے "اِلَّا" سے پہلے آیت میں جو چیز ممنوع قرار دی گئی اس کو "اِلَّا" کے بعد والی صورت میں جائز قرار دیا گیا ہے۔"

حکم تقیہ کی بنیاد :- خطرہ سے بچنے کے لئے بعض اوقات وہ باتیں جائز ہو سکتی ہیں جو بغیر اس کے جائز نہیں۔ جان کی قدر و قیمت یقینی ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت اور عدم حفاظت کے لئے قواعد و ضوابط کا ہونا ضروری ہے جس کی رُو سے اہم موقع کی پہچان ہو جہاں پر جان کا دینا لازم ہو اور بعض مواقع کا ایسا ہونا بھی ناگزیر ہے جہاں جان کا بچانا لازم یا کم از کم جائز ہو۔

شریعتِ اسلام میں وہ وقت جہاں جان کے دینے پر تیار ہونا چاہیئے موقع جہاد ہے اور وہ وقت جہاں جان کا بچانا لازم یا جائز ہو محل تقیہ ہے۔ علامہ نقی صاحب اس سلسلے میں ایک دلچسپ مثال دیتے ہیں :-

" فرض کیجئے کہ آپ نے کسی سے یہ وعدہ کیا ہے کہ میں تمہارے راز کو افشا نہ کروں گا، اب اس نے اسی وعدہ پر کوئی راز آپ کے سپرد کیا، اس کے بعد اُس کا کوئی دشمن اس کے اس راز کو آپ سے دریافت کرتا ہو تو اب دیکھئے کہ یہاں حقیقت کا اظہار کر دینا سچائی ہے یا نہیں۔ خود اس کلام اور اس کے مطابق واقعہ ہونے کے لحاظ سے دیکھئے تو وہ سچا ہوگا مگر اس وعدہ کے لحاظ سے دیکھئے جو آپ نے افشائے راز نہ کرنے کے متعلق کیا ہے تو یہ اظہار کرنا 'سچائی' کے خلاف ہے۔"
(تقیہ کے لئے تیز فہم اور سنگین حالت کی شناخت شرط ہے، عام لوگ عام طور پر اس کے اہل نہیں ہوتے)

تقیہ کے شرائط و قیود :- (اسی حوالہ سے اختصاراً)

۱ ـــــ تقیہ دفع مضرت کے لئے ہوتا ہے۔ حصول منفعت کیلئے نہیں،

۲ ـــــ تقیہ کی مشروعیت حقوق اللہ میں ثابت ہے، حقوق الناس میں نہیں۔ مثلاً اپنی جان بچانے کے لئے کسی دوسرے کی جان لینے کا

حق نہیں، یا اپنی آبرو کے تحفظ کے لئے دوسرے کی آبرو ریزی کا حق نہیں یا اپنے مالی نقصان کو بچانے کے لئے دوسروں کو مالی نقصان میں مبتلا کر دینے کا حق نہیں۔

۳ تقیہ کبھی واجب، کبھی مستحب، کبھی مباح، کبھی مکروہ اور کبھی حرام ہو جاتا ہے۔ اگر شریعت کی آبرو کسی کے جان دینے پر موقوف ہے تو پھر تقیہ (جان بچانے کے لئے) حرام ہوگا۔

محل تقیہ کا موازنہ :۔

(i) اگر مفاد دینی مقدم ہو اور اس کی حفاظت کا انحصار اس شخص میں ہو، سوا اس کے کوئی دوسرا اس کام کو انجام ہی نہ دے سکتا ہو تو تقیہ حرام ہوگا۔

(ii) اگر مفاد دینی اہم اور مقدم ہو لیکن دوسرے بھی اس خدمت کو انجام دے سکتے ہوں اور/یا انجام دے رہے ہوں اور اس شخص کی ذات کے ساتھ کوئی دوسری اہم خدمت جو اُسی کی ذات سے وابستہ ہے متعلق نہ ہو تو اس کے لئے دین کی خاطر قربانی کو پسند کرنا مستحسن یا مستحب ہوگا۔ اور اس وقت "تقیہ" کو مکروہ سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس لئے اگر تقیہ سے اپنی جان کو بچالے تو موردِ عذاب یا خدمت نہیں ہوگا کیونکہ مکروہ فعل کا یہی حکم ہے۔

(iii) جان کے جانے سے کوئی خاص دینی فائدہ مدنظر نہ ہو لیکن۔

احترام مذہب دعوت دیتا ہو کہ سچائی کے ساتھ اپنے خیالات کو ظاہر کر دے اور اصول پر قائم رہے، اور اس کی ذات کے ساتھ آئندہ کوئی مذہبی مفادات وابستہ بھی نہ ہو جو اس کے جان دینے سے تلف ہوتے ہوں تو ایسے مقام پر تقیہ جائز و مباح ہو سکتا ہے یعنی اختیار میں ہوگا۔ یعنی یہ تقیہ جائز (مباح) ہوگا مگر اس کے ترک میں بھی گنہگار نہ ہوگا۔

(iv) جان دینے پر کوئی دینی فائدہ مرتب نہیں ہے صرف احترام دین اور سچائی کا ولولہ خطرہ کی طرف قدم بڑھانے کی دعوت دے رہا ہے۔ مگر جان کی حفاظت کے ساتھ امکان ہے کہ کچھ دینی خدمات انجام دے سکے، اس صورت میں تقیہ کر کے جان بچانا مستحسن یعنی مستحب ہوگا۔

(v) اگر جان دینے پر کوئی دینی فائدہ یا مقصد مرتب نہیں تو تقیہ ضروری ہوگا بلکہ اس کا ترک کرنا حرام اور باعث مؤاخذہ اخروی ہوگا۔ تقیہ کا حکم شخصیتوں، منصبی ذمہ داریوں، موقعہ و محل اور ظلم و کفر کے مزاج سے بھی مطابقت رکھتا ہے، زمان و مکان سے بھی اس کا رشتہ ہے۔ یاسر اور سُمیہ کفر کے نرغے میں تھے، یہ شرائط و مرحلہ شناسی ان کے سامنے تھی، ایمان کے خلاف ایک حرف کہنا بھی گوارا نہ کیا، شہید کر ڈالے گئے۔ انہی کا بیٹا عمار (عمار یاسر) جوان تھا۔ آگے دین کی راہ میں کارنمایاں انجام دینے کا ولولہ، شوق اور نظر

ہے۔ مشرکین کے منشاء کے مطابق چند الفاظ زبان پر لاکر چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ آیت اس کی تائید میں نازل ہوتی ہے۔" اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ"۔ رسول اللہ صلعم (صورت حال کے مرحلہ و مزاج کے مطابق) ارشاد فرماتے ہیں ۔" اگر ایسا اتفاق ہو تو پھر تم یہی عمل اختیار کرنا۔"

تقیہ کی اصلیت و حکمت و شرائط کو سمجھنے کے لئے ائمہ طاہرینؑ کی سیرت او حالات زمانہ کے مطابق ان کے رول کو سمجھنا ضروری ہے۔ شیعہ امامیہ پر تاریخ میں تابڑ توڑ تشدد ہوا جو ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس کے پس منظر پر قطعی نظریہ قائم کرنا مشکل ہے۔ لیکن فعلاً ایسا ہوا اس لئے فقہاء شیعہ نے اس کے خدوخال کو زیادہ واضح کیا۔ لیکن یہ واقعیت دنیا میں ہر زمان و مکان کے اندر ثابت اور واضح ہوئی ہے۔ کہ بلالحاظ مسلک اکابر و منصب داران اہل اسلام نے اس حکمت کو حکمت شناسی کے ساتھ اپنایا ہے۔ مسلمانوں کے سواد اعظم کی عام سطح کو اس کی حکمت و ضرورت کا احساس اس لئے نہیں ہوا کیونکہ عموماً ان کو اُن حالات سے نہ گزرنا پڑا' جن حالات سے شیعہ امامیہ کو دوچار ہونا پڑا۔ نیز جہاں اور جب شیعہ امامیہ میں عام سطح پر علمی فقدان رہا۔ تقیہ کے صحیح طور پر سمجھنے میں بھی فساد وارد ہوا۔

۶۔۔۔ خمس اور عشر (مذاہب خمسہ)

(۱) ائمہ اربعہ :۔

سورہ انفال' پارہ ۱۰ آیت ۴۱ کا مفہوم :۔

" اور جان لو کہ جو کچھ تم غنیمت حاصل کرو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول صلعم اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور پردیسیوں (مسافروں) کے لئے ہے' اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن جبکہ دو لشکر (جنگ بدر میں) آملے تھے۔ نازل کیا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (ترجمہ از تفسیر حقانی)

بحوالہ تفسیر حقانی ۔ عقائد اہل سنت کے مطابق اس خمس (پانچویں حصہ) کی تقسیم میں آنحضرت صلعم کے بعد دو قول ہیں۔ آنحضرت صلعم کا حصہ جمہور علماء کے نزدیک' جن میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ بھی ہیں' اسلام کے مصارف اور اس کی ضرورتوں میں صرف ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ ذوی القربیٰ' یتامیٰ' مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم ہوگا۔ آپؐ کے اقارب کے حصہ میں بھی اختلاف ہے ۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کے بعد بھی ان کے اقارب کو حصہ ملے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے کہ یہ رقوم بیت المال کا حصہ ہوں گی اور غریبوں اور یتیموں کی پرورش بیت المال کی ذمہ داری ہے۔ غنیمت کے باقی چار حصوں کے بارے میں متعدد علماء نے احادیث سے

اسلامی سپاہ میں تقسیم کرنا ثابت کیا ہے۔ البتہ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ امام کو اختیار ہے کہ ہر حاجت وضرورت میں حسب مصلحت صرف کرے۔ اکثر مالکیہ کہتے ہیں کہ خلفائے اربعہؓ آپؐ کے بعد ایسا ہی کرتے تھے۔

بروئے مذاہب اربعہ اہل سنت خُمس بحوالہ آیت بالا عشر کے معنی ہیں دسواں حصہ جس کا مدرک خداداد مال وجائداد ہوتی ہے۔ جو زمین وجائداد اہل اسلام کو اجتماعی جہد سے حاصل ہو اس کی نسبت واضح ہے۔ باقی زمان ومکان کے حالات کے مطابق ہیں۔ حکومت اسلامی میں امیر کے اوپر تکلیف شرعی عائد ہے۔ قوۃ مجریۂ (امیر اسلامی) میسّر نہ ہو تو قانون کے اجراء کا اختیار اکابرین علماء ومجتہدین کو ہے۔

(۱۱) شیعہ امامیہ :- شیعہ امامیہ کی رو سے خُمس سات چیزوں پر واجب ہوتا ہے۔ ۱۔ کاروبار کا سالانہ حساب سے نفع، ۲۔ کانیں ۳۔ خزانہ، ۴۔ وہ مال جو حرام میں مخلوط ہوا ہو اور الگ کرنا ممکن نہ ہو۔ ۵۔ جواہرات جو غوطہ زنی سے ملے ہوں، ۶۔ مال غنیمت، ۷۔ وہ زمین جسے کافر ذمی مسلمان سے خریدے۔ ان کے مفصل احکام، مرجع مجتہدین کے توضیح المسائل میں موجود ہیں۔

آیت مذکورہ کا ترجمہ اس طرح ہے ۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ ۔ یعنی :- اور جان لو جو نفع تم کسی چیز

سے حاصل کرو تو اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسولؐ اور (رسولؐ) کے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور پردیسیوں کا ہے (باقی حصہ اسی طرح)

حدیث۔ رسولؐ کا ارشاد ہے :- تم کو چار چیزوں کا حکم دیا گیا ہے۔ ۱۔ خدا پر ایمان، ۲۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، ۳۔ ماہ رمضان کا روزہ رکھنا، ۴۔ اور جو نفع حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ دینا (بحوالہ البخاری: ج۱)

شیعہ امامیہ میں احادیث رسولؐ تواتر کے ساتھ آتے ہیں اور سیرت رسولؐ جو تاریخ سے ثابت ہے، کے مطابق جو ترجمہ آیت مذکورہ کا کیا گیا ہے وہ قرین صحت مانا جاتا ہے۔ اس میں خُمس کو مال غنیمت (از غیر مسلم) تک محدود نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے مراد ہے جو نفع تم کسی چیز سے حاصل کرو۔ امامیہ مذہب میں سات واضح چیزوں میں جن میں خمس واجب ہے "غنیمت" بھی ہے۔ جو اصطلاح میں وہ مال غنیمت ہے جو غیر مسلم سے (جنگ میں) ملا ہو۔ شیعہ امامیہ سال بھر جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کا خُمس نکالتے ہیں۔ اور غنیمت کی تفسیر ہر حاصل ہونے والی آمدنی سے کرتے ہیں۔ شیعہ امامیہ میں ہر جگہ آیات کے سیاق وسباق (ماقبل ومابعد) کو تفسیر میں مقدّم نہیں رکھا جاتا ہے۔ بلکہ آیات قرآنی کی تفسیر میں متواتر احادیث اور تشریح معصومینؑ اور حقیقت وحقیقتِ واقعیت کو مقدّم کیا جاتا ہے۔ چونکہ خُمس والی آیت حرب وقتال کے آیات کے درمیان آئی

ہے اس لئے سنّی مفسرین نے اسی کے ذیل میں رکھ کر ترجمہ کیا ہے ۔
شیعہ امامیہ نے دیگر نصوص جو واضح ہیں کی روشنی میں تفسیر کی ہے ۔

زکوٰۃ وصدقات سلسلۂ اقرباء رسول صلعم (سادات) پر جائز نہیں ہے ۔ نصاب زکوٰۃ کے لئے واضح احکام شیعہ وسنّی کے یہاں گہری مماثلت رکھتے ہیں ۔ خُمس کا آدھا حصّہ یعنی کُل کا دسواں حصّہ اقرباء (سادات) میں یتیم، مسکین اور پردیسی (مسافر) کے لئے جائز ہے ۔ اگر مستحق نہ ہو تو مجموعی حکم کی روشنی میں امام (حاکم شرع ۔ نائب امام) مناسب امور پر صرف کرسکتا ہے ۔ دوسرا آدھا حصّہ یعنی سہم امام، امام مجتہد اعلم کی ہدایت سے عادل علماء یا اداروں کے اختیار میں اس شرط پر کہ وہ یہ رقم احکام دین کی ترویج اور اسلام کی تبلیغ میں حساب رکھ کر صرف کریں ۔ ان کے حقوق کا خیال رکھیں کہ جو اسلامی خدمات اور تبلیغ حق انجام دیتے ہوں، رکھا جاتا ہے ۔

عموماً شیعہ امامیہ خُمس کا آدھا (بچی ہوئی آمدنی) کا سالانہ دسواں حصّہ (عشر) غریب سادات کو باقی دسواں حصّہ جو رسولؐ کے بعد امامؑ اور امامؑ کے بعد نائب امام (مجتہد اعلم) کا حصّہ کہلاتا ہے ۔ مجتہد کے حکم کے مطابق مذکورہ مصارف پر صرف کرنے کے لئے علماء اور اداروں کو دیتے ہیں ۔ سہم امام کے صرفہ پر بین الاقوامی سطح کا منظم کنٹرول البتہ ضروری ہے، ہر جگہ اور ہر حال میں علماء کرام پر، جن کی

پوزیشن گروہ بندی میں ملوّث ہو یا جن کا کردار مشکوک ہو، مح ر اور نظر رکھنے کا نظم بھی ضروری ہے جس کی طرف اہل علم و دانش متوجہ ہیں اور مراجع کرام جس کے متمنّی ہیں ۔

۷۔ قضاء وقدر:۔ (شیعہ امامیہ کی نظر میں)

بحوالہ شرح نہج البلاغہ، شیخ عبدہ، ج ۴

ایک شخص نے حضرت علیؑ سے قضا و قدر کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا :۔

"شاید تو نے لازمی قضا اور حتمی قدر کے بارے میں گمان کیا ہے اگر ایسا ہوتا تو ثواب وعقاب سب باطل ہوجاتا اور وعدہ وعید سب ختم ہوجاتا ۔ خداوند عالم نے اپنے بندوں کو اختیار دیتے ہوئے حکم دیا ہے اور ڈراتے ہوئے نہی کی ہے ۔ ان کو تھوڑی سی تکلیف دی ہے ۔ ناممکن چیزوں کی تکلیف نہیں دی ۔ تھوڑے (عمل) پر زیادہ ثواب دیا ہے ۔ خدا کی معصیت نہ مغلوب ہوکر کی جاتی ہے نہ مجبور ہوکر اطاعت کی جاتی ہے ۔ خدا نے انبیاء کو بلاوجہ نہیں بھیجا اور نہ بندوں کے لئے کتاب کو عبث نازل کیا ہے اور نہ زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کو باطل پیدا کیا ہے یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جو کافر ہیں ۔"

مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: کہ اگر خدا اپنے بندوں کو اپنے اوامر پر مجبور کر دیتا تو بندوں کے بس کی بات نہیں تھی کہ اس کی مخالفت کر سکیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار بندوں کو ہے۔ چاہیں تو اطاعت کریں چاہیں تو نافرمانی کریں۔ قرآنی آیت پ ۱۵، سورہ کہف آیت ۲۹ کا مفہوم بھی یہی ہے ؎

'جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے'

مفہوم' قرآن پ ۱۵ بنی اسرائیل آیت ۹:۔

'اس میں شک نہیں کہ یہ قرآن اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی ہے۔"

حضرت امام جعفر صادقؑ (چھٹے امام) کے اس قول کہ ؎ "لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِيْضَ وَلٰكِنْ اَمْرٌ بَيْنَ اَمْرَيْنِ" کا مطلب انہی کی توضیح سے سمجھیں، فرمایا:۔

" تمہارا زمین پر چلنا اور زمین پر گرنا دونوں ایک بات نہیں ہے بلکہ دونوں میں فرق ہے۔" انسان بعض صورتوں میں مختار ہے اور بعض میں مجبور ہے۔

مزید نصوص:۔ قرآن، پ ۳۰، الشمس آیت ۷ تا ۱۰۔ پ ۲۹، القیامۃ، آیات ۳۶ تا ۴۰

ایک شخص نے امام رضاؑ (آٹھویں امام) سے امام صادقؑ کے

(مذکورہ بالا قضا و قدر سے متعلق) قول کے بارے میں دریافت کیا' آپ نے تشریح فرمائی:۔

" جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ ہمارے تمام افعال کا کرنے والا خدا ہے وہی ہم سے ہمارے افعال کرا کے ہم کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے وہ جبر کا قائل ہے۔ اور جس شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے خلق کرنے اور رزق دینے کا کام ائمہؑ کے سپرد کر دیا ہے وہ تفویض کا قائل ہے۔ جبر کا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے اور تفویض کا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہے۔"

ائمہ طاہرینؑ نے قرآن کی جس طرح اپنے ارشادات میں تشریح فرمائی ہے' اس سے تمام مسلمانوں کو عقائد کلی و جوہری میں استفادہ کرنا چاہیئے۔ رسول خدا صلعم نے ان کے بارے میں یہ پیش گوئی فرمائی ہے کہ ؎

" اُن سے آگے نہ بڑھو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے بھی نہ رہو ورنہ پھر بھی ہلاک ہو جاؤ گے۔ ان کو تعلیم دینے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ یہ تم سے زیادہ اعلم ہیں۔"

(بہ حوالہ:۔ صواعق محرقہ، مجمع الزوائد ج ۹، ینابیع المودۃ ص ۴۱ در منثور ج ۲، کنز العمال ج ۱، طبقات الانوار ج ۱۔ اسد الغابہ ج ۳ ـــــ بہ واسطہ نشریات مؤسسہ انصاریان، قم۔ ایران)

۸۔ ایمان ابو طالبؓ۔ حضرت ابو طالب کے بارے میں جو واقعات وارد ہیں، تاریخ میں محفوظ ہیں، لیکن ان سے نتیجہ گیری کے لئے رہنمائی

حکمت وخطوط سے استفادہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہاں مناظرہ مقصود نہیں، مذہب امامیہ کے موقف اور ضروری یادداشتوں کا بیان مطلوب ہے۔ حضرت عبدالمطلب کے بعد حضرت ابوطالب نے آنحضور صلعم کی پرورش اس طرح کی کہ آپؐ کو اپنے فرزندوں سے زیادہ عزیز رکھتے، آپؐ کے بستر اور بستر کی جگہ تبدیل فرماتے رہتے اور اس میں اپنے فرزندوں کو باری باری سُلاتے۔ حضرت ابوطالب نے نہایت حکمت کے ساتھ آنحضورؐ کو دشمنوں کی سازش اور شرارتوں سے حفاظت و نگرانی میں رکھا۔ آنحضور صلعم کی تقریب نکاح میں سرپرستی فرمائی اور ایجاب وقبول کی وکالت کی۔ اس موقعہ پر خدائے واحد کے شکرانہ میں اشعار پڑھے۔ دعوت ذوالعشیرہ سے شعب ابی طالب میں محصوری تک اور پھر عام الحزن [وہ سال جس میں آپؐ اور حضرت خدیجہ نے وفات پائی اور آنحضور صلعم نے اس سال کو "غم کا سال" (عام الحزن) قرار دیا] میں رحلت تک سخت مشقتوں اور معاونتوں کا ثبوت دیا۔ کسی موقعہ پر بھی کلمۂ کفران کی زبان سے نہ نکلا۔ نہ رسول اللہ صلعم نے اور نہ کسی معصوم نے اور نہ برگزیدہ رواۃ صحابہ کے اجماع نے اُن کے کفر کے بارے میں اعلان کیا۔ نہ اُن کے ایمان پر تردّد یا انکار کا اعلان سامنے آیا۔
رسول اکرم صلعم نے ان کو "باپ" کہہ کر پکارا اور ان کی رحلت پر گریہ

دریغ فرمایا۔ ان کے تمام فرزندوں نے رسول اللہؐ کے لئے فداکاری کی۔
شیعہ امامیہ کا موقف ہے کہ برملا اعلانِ بیعت نہ کرنا کمالِ حکمت تھی۔ وہ پہلے سے بلکہ قبل از بعثت خدا و رسول صلعم پر ایمان رکھتے تھے ان کو ایمان کے اعلان کی ضرورت بھی کیا تھی! مثلاً فرعون کی بیوی مومنہ تھی لیکن حکمتاً مصالح عظیم کے پیش نظر اپنے ایمان کو چھپائے رکھا، مومن آل فرعون حبیب نجار کی مثال تاریخ میں محفوظ ہے۔

۹۔ خاک پر سجدہ:۔ شیعہ علماء کا اجماع ہے کہ زمین پر سجدہ کرنا افضل ہے۔ ائمہ معصومین کے ذریعے ان کے جدّ، رسول خدا صلعم کی روایت ہے کہ "سب سے افضل زمین پر سجدہ کرنا ہے۔" ایک روایت میں جو اسحاق بن الفضل سے مروی ہے، امام حسینؑ سے چٹائی اور بوریا جو قصب سے بنائی گئی ہو پر سجدہ کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا، تو امامؑ نے فرمایا — "کوئی حرج نہیں ہے۔"

بخاری اور مسلم میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسول خداؐ کے پاس کھجور کی چھالوں اور مٹی سے بنی ہوئی ایک چیز سجدہ گاہ کی طرح کی تھی جن پر حضورؐ سجدہ کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں کتاب الحیض میں ہے کہ جناب عائشہؓ فرماتی ہیں:۔

"رسول خدا نے مجھ سے فرمایا (خمرہ) سجدہ کرنے والی چیز مجھے دیدو۔" جناب عائشہؓ نے کہا: 'میں حیض سے ہوں' تو رسول خدا

نے فرمایا — "تمہارے ہاتھ میں تو حیض نہیں ہے"۔ (امام مسلم مزید فرماتے ہیں کہ خمرہ ایک چھوٹا سا سجادہ ہوتا ہے جو صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس پر سجدہ کیا جا سکے۔ ایک روایت بخاری میں ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلعم زمین پر سجدہ کرنے کو محبوب رکھتے تھے۔ روایات میں ہے کہ امام حسینؑ زمین پر سجدہ کو انکساری و تواضع کے اظہار کا ذریعہ کہتے تھے۔ شیعہ امامیہ مٹی پر سجدہ کو افضل سمجھتے ہیں اور چھوٹے چپٹے ڈھیلا کا سجدہ گاہ رکھتے ہیں جو زیادہ تر کربلا میں بنتا ہے۔ علماء کرام ایسے سجدہ گاہ کو ترجیح دیتے اور پسند کرتے ہیں جو سادہ و صاف ہو اور جس پر کچھ کندہ یا لکھا ہوا نہ ہو۔

۱۰۔ ولایت فقیہ کے اساسی خدوخال :۔

ولایت فقیہ سے مراد ہے حکومت اسلامی، جس کا سربراہ متقی اور باصلاحیت عالم و فقیہ ہو۔ انتظامات کی نگرانی وہی کرے۔ سیاسی اور تنظیمی قوت، گرفت قوۂ اجراء کے لئے موثر ذریعہ ہے، جب یہ میسر نہ ہو تو قوۂ افتاء یعنی فتوائے شرعی صادر کرنے کی قوت تو موجود ہوتی ہے اس کو عملانے کا قانونی ذریعہ میسر نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے جب اور جہاں اس کا شرعی امکان ہو، شرعی حدود وسائل کے ذریعے اس کا قیام و ترویج وظیفۂ شرعی ہے۔

ولایت امر اور ولی فقیہ

اَطِیعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیعُوا الرَّسُولَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ میں بظاہر چار ولایتوں کا اشارہ ہے :۔

۱۔ ولایت خدا، ۲۔ ولایت رسولؐ، ۳۔ ولایت امامؑ، ولایت فقیہ۔ دوسری طرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا اقرار اس اعتقاد کا اظہار ہے کہ "ایک ولایت" کے علاوہ کوئی ولایت نہیں ہے۔ ولایت خدا کے مقابل میں "ولایت رسولؐ" کا کوئی الگ وجود نہیں ہے۔ ولی کا وجود ہے۔ سورہ انعام میں وضاحت ہے کہ رسول صلعم کو جھٹلانا اللہ کے نزدیک، اللہ کو جھٹلانا ہے۔ سورہ نساء آیت ۸۰ سے واضح ہے کہ ولایت رسولؐ ولایت اللہ ہے۔ یہ الگ الگ اور مختلف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی حاکمیت کے بارے میں "ولایت رسولؐ" کے ذریعے امتحان میں ڈالتا ہے۔

خوارج کہتے تھے — لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہ ۔ وہ سورہ یوسف آیت ۴۰ کا حوالہ دیتے تھے، اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہ ۔ یہ کلمۂ حق ہے لیکن خوارج اس کو غلط طریقے پر پیش کرتے تھے، ان کا مقصود اس سے باطل تھا وہ اللہ کی حکومت زمین پر نہیں چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ گویا "اللہ خود آ کر حکومت کرے گا۔ ورنہ حکومت کا حق کسی کو نہیں ہے"۔ ظاہر ہے کہ حکومت فعلاً انسان ہی چلائے گا لیکن اللہ کے قانون

کے مطابق چلائے گا۔

رسول اللہ صلعم کے بعد ولایت امر کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا ہے، امامت میں منتقل ہوتا ہے۔ خدا، وسیلہ کے بغیر یہ کام انجام نہیں دیتا ہے۔ ولی یعنی ولایت کا اہل، 'بِدُونِ اللہ' نہیں 'فی طریق اللہ' یعنی اللہ سے الگ ہو کر نہیں "اللہ کے راستے میں" حکومت کا نظام چلائے گا۔ اللہ اگرچہ ہر جگہ حاضر و قادر ہے لیکن اس نے انبیاء اور اوصیاء کے ذریعے یہ امر انجام دلایا۔

"مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ"

اسی ولایت کا اعلان ہے۔ حضرت علیؑ کے بعد ائمہ طاہرینؑ کا سلسلہ ۳۲۹ھ یعنی امام مہدیؑ کی غیبت کبریٰ تک چلا۔ تب سے اصولاً یہ ولایت معطل نہیں، جاری ہے۔ احکام خدا کا اجراء اور ان کا نفاذ معطل نہیں رہ سکتا۔

ولی فقیہ میں ان خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:۔

۱۔ اسلام، ۲۔ عقل، ۳۔ قدرت و حُسنِ تدبیر یعنی "صلاحیت ادارہ جامعہ"، ۴۔ علم، ۵۔ عدالت، ۶۔ مرد ہونا، ۷۔ حلال زادہ ہونا۔ عقلاً یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگوں کے مال، جان اور ناموس کو (یعنی اس اتھارٹی کو) جس کے ہاتھ میں دیا جائے وہ متقی نہ ہو۔ قرض، لین دین، عدالتِ امامت نماز جماعت، طلاق وغیرہ جیسے

امور کے لئے دو عادل شواہد کا ہونا اور گواہی دینا ضروری ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ "ولی فقیہ" کی عدالت اور تقویٰ کی منزل بلند ہونی چاہئے۔ جو منصب دار نفس پرست اور جاہل ہوتے ہیں، ملک کے مال و جان کا بیجا استعمال کر کے تباہی مچاتے ہیں۔

امام صادقؑ نے اس کے لئے چار شرائط کی نشاندہی فرمائی ہے:۔

۱۔ اپنے خواہشات کو قابو میں رکھتا ہو، ۲۔ دین کی حفاظت میں متوجہ رہتا ہو، ۳۔ ھوٰی و ہوس کا مخالف ہو، ۴۔ اپنے مولا کی اطاعت میں لگا رہتا ہو۔

صلاحیت ادارۂ جامعہ

ولی فقیہ کا "مدیر اور مدبّر" ہونا ضروری ہے۔ اگر علم اور تقویٰ رکھتا ہے لیکن سیاست دان نہیں ہے، جامعہ شناسی نہیں ہے، سیاست زمان پر نظر نہیں رکھتا ہے، شجاعت، قوتِ فیصلہ اور سیاسی نظر نہیں رکھتا ہے تو وہ جامعہ (سوسائٹی) پر اجتماعی حکم نافذ کرنے کا اہل نہیں ہوگا۔ (البتہ ہر حال میں سیاسی و انتظامی اقتدار کا عمل دخل شرط التزامی نہیں ہے)

اختیارات ولی فقیہ

۱۔ ولاءِ افتاء:۔ یعنی فتویٰ کی ادائت و اجراء، ۲۔ ولاءِ قضاء یعنی سپریم جوڈیشل پاور، ۳۔ ولایت (حکومت و رہبری) بر اموال و انفس

یعنی لوگوں کے مال و جان پر اختیار د۔

اس بارے میں فقہاء کے درمیان خطوطِ اختیار پر اختلاف ہے۔ بعض اختیارِ کُلی کے قائل ہیں اور بعض محدود اختیار کے قائل ہیں۔ غالب نظریہ یہ ہے کہ حالات شدید ضرورت کا تقاضا کرتے ہوں، فسادِ شخصی یا نوعی واضح ہو، اصلاح ناگزیر ہو، امکان واضح ہو تو اس اختیار کا استعمال ولی فقیہ کر سکتا ہے۔

ولی فقیہ کے سامنے کبھی درج ذیل نوعیت کے مسائل آتے رہتے ہیں۔ مثلاً غاصب، حملہ آور دشمن کی لوٹ مار۔ قاصرین پر ولایت کی صورت مثلاً دیوانہ، یتیم۔ امور حسبیہ اور حادثہ، واقعہ (یعنی ہنگامی قسم کے مسائل و امور جن کے تکلیف شرعی کا جاننا ضروری ہے)۔ اسلامی حکومت کی موجودگی میں درآمدات اور برآمدات کے شرعی حدود طے کرنا۔ داخلی اور خارجی روابط۔ اطلاعاتی (جاسوسی سسٹم) امور سرمایہ کاری اور جدید ٹیکنالوجی کے اطلاق سے پیدا شدہ نئے مسائل کا حل وغیرہ[1]

عمومی تبصرہ :-

شیعہ امامیہ کے متعلق بعض مسائل اور اوامر میں عجیب قسم کی غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں اور بعض

[1] نوٹ: ولایت فقیہ کے موضوع پر مختصر روشنی سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ امت میں معروف مکاتب فکر اسلامی کے لئے ایک دوسرے کی نزدیکی اور اجتہادی مرکزیت کی موجودگی کس قدر اہم ہے۔

مسائل میں عام بے توجہی کی وجہ سے، اصول و شرائط اور قواعد کے سلسلے میں خود عامۃ الشیعہ بھی غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ جبکہ نئے سے نیا مسئلہ بھی علماء فقہ نے حل کر دیا ہے اور مراجع (مجتہدین اہل افتاء) کے "توضیح المسائل" کتب میں فتویٰ کے ساتھ موجود ہیں۔ اور شرائط واضح ہیں۔ مثلاً نکاح اور مرد و زن کے تعلقات کے بارے میں جس طرح مسائل شیعہ امامیہ میں، تفصیل و استدلال کے ساتھ واضح اور صادر ہیں۔ کفو، مہر، اجازت والد/سرپرست وکیل شرعی برائے باکرہ، ایجاب و قبول، طلاق بائن، طلاق رجعی، خُلع، خُلع بواسطہ حاکم شریعت، نکاح دائمی و معین مدت کی نکاح کے شرائط و حدود، نان و نفقہ وغیرہ تجارتی معاملات، تقسیم ترکہ کی نشاندہی، تعزیرات، معاشیات کے مسائل اور جدید مسائل مرتب و مدون ہیں۔

عوامل اتحاد اسلامی

۱۔ مسلمانوں میں فروعی اور جزوی مسائل پر بعض اوقات سخت چپقلش ہوتی ہے۔ مثلاً رفع یدین اور آمین بالجہر پر گروہ بندیاں ہوتی ہیں۔ تجوید و تلفظ کی بحثیں چلتی ہیں۔ اس روش میں مثبت اپروچ کی ضرورت ہے۔ ۲۔ مسلمانوں میں فقہی مسائل میں اختلاف بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ مسائل میں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً فقہ امامیہ کے متعدد مسائل مالکیہ سے ملتے ہیں۔

بہت سے اجتماعی امور میں حنابلہ اور امامیہ کے درمیان گہرا فکری رابطہ ہے۔ شخصی مسائل میں حنفیہ، امامیہ اور شافعیہ کے متعدد مسائل ملتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی مسئلے کے کئی مجتہدین کی رائے میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ بنیادی اصول کے مفاہیم میں یکسانیت بھی ہے۔ ہر وہ شخص (مسلمان) جو توحید، رسالت وختم نبوت اور آخرت پر اعتقاد رکھتا ہے اس کا اقرار کرتا ہے، اصولاً دائرہ اسلام میں شامل ہے۔

۳۔ دعوت الی اللہ اور مجادلہ (بحث ومباحثہ) میں حکم قرآن کے مطابق، ہر مسلمان کو حکمت، موعظۂ حسنہ اور جدال احسن اپنانے کی تاکید ہے۔ تبلیغ کا انداز باحوالہ، مثبت اور اصلاحی ہونا چاہیئے۔ مختلف مسالک اسلامی خصوصاً مذاہب خمسہ کے مدارک وعقائد سے صحیح واقفیت ہونی چاہیئے۔ یعنی اس کا ماخذ اور ذریعہ اچھے اور متقی اہل علم وافتاء اور اچھی اور دلپذیر کتابیں ہونی چاہیئے جس سے تعصب نہ چھلکتا ہو، محبت، خلوص، ایثار اور جذبہ اخوت واصلاح حقیقی کا ولولہ وشوق چھلکتا ہو۔ جس میں اپنے موقف کی ترجمانی مثبت اور مؤدب انداز میں کی جاسکے۔

۴۔ تبلیغات وتحاریک کا اصل مقصد انسانی قدروں کا احیاء اور شریعت اسلامی کے عائلی اور مرکزی احکام کی بالادستی ہونی چاہیئے۔ مکان وزمان، ملک ومعاشرہ کے مزاج وضرورت کا احاطہ بھی کرنا چاہیئے۔

۵۔ اُمت مسلمہ کے دنیوی واخروی فوائد کے پیش نظر تمام مسالک اسلامی کو بنیادی اور مشترکہ مسائل میں وحدت فکر وعمل کی کوشش کرنی چاہیئے۔

۶۔ اہل سنت کے چار معروف مسالک اور شیعہ امامیہ کے معروف مسلک وہمہ گیر (شیعہ امامیہ) یعنی مذاہب خمسہ کے درمیان تقرب اور استفادہ عامہ کے ذریعے عالمگیر تحریک کو منظم کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ ۱۹۵۶ء میں ایران کے آیت اللہ سید بروجردیؒ اور مصر (جامعۃ الازھر) کے مفتی اعظم شیخ محمود شلتوتؒ نے "دار تقریب بین المذاہب خمسہ" کی جو بنیاد رکھی تھی اسے استوار اور وسیع کرنا چاہیئے۔

۷۔ مبلّغین کو انسان پر انسان کے حقوق، مسلمان پر مسلمان کے حقوق، پڑوسی پر پڑوسی کے حقوق، رشتہ دار پر رشتہ دار کے حقوق، ماں باپ اور اولاد کے باہمی حقوق، بھائی پر بھائی کے حقوق، بہنوں اور بیٹوں کے حقوق، شوہر و بیوی کے باہمی حقوق، فرد اور سوسائٹی کے روابط، کمزور، مظلوم، محکوم، غلام وغیرہ کے حقوق، نباتات وحیوانات کے بارے میں انسان کی تکلیف اور جوہریات اسلام کی نشاندہی کرنی چاہیئے۔

۸۔ مسلمان آپس میں بین الاقوامی سطح پر ایکدوسرے کے امور ومسائل کو سمجھنے کی کوشش کرنے کا درد اور احساس پیدا کریں اور

علمی و تجارتی و تبلیغاتی تعلقات کو استوار کریں۔ ایک دوسرے کی مجالس و مساجد میں جائیں۔ ایک دوسرے کے مسالک کا مطالعہ کریں۔ فیض عمومی کی نظر پیدا کریں۔ اور ایک دوسرے کے نکتۂ نظر کو اسلامی اخلاق اور معقولیت پسندی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔

۹۔ تعزیرات اسلامی میں فقہی و اجتہادی مرکزیت کو مجتمع کرنے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے، تاکہ قانون کا تقدّس پامال نہ ہو اور غیر شرعی حرکات اور اقدامات سے اسلام اور مسلمان بدنام نہ ہوں۔

۱۰۔ اسلامی بیداری اور نفّاذِ شریعت اسلامی کے لئے مختلف مکاتب فکرِ اسلامی کے درمیان فکری ہم آہنگی ضروری ہے۔ بندوں کے ہاتھوں قانون الٰہی کے اجراء میں قضاوت و تحقیق بنیادی شرائط ہیں۔ سماجی فلاحی مسئلہ ہو یا سیاسی تنظیمی، افراط و تفریط، مضر اور معیوب ہے۔

۱۱۔ اسلام کو عملاً نافذ کرنے کے سلسلے میں بڑی مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔ خود آنحضور صلعم کے زمانے میں بہت سے مسلمانوں پر تعزیراتی عقاب کا اطلاق ہوا۔ مجرموں پر سزائیں دی گئیں۔ بعض خدا ترس اور تائب گناہ کے بعد خود پیش ہوئے تاکہ سزا پاکر پاک ہو جائیں۔ ھدفِ تحریک اسلامی یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اور خصوصاً مسلم معاشروں کی سطح پر خیر کا غلبہ رہے۔ اور شر مغلوب رہے۔ اگر ہم یہ

سوچیں کہ شر پوری طرح ختم ہو جائے یہ خیالی یا عنقائی ذہنیت کی دلیل ہوگی البتہ ہماری باطنی تمنّا اور ظاہری کوشش اس نہج اور استقلال پر قائم رہنی چاہئے۔ اہل اسلام میں غلطیاں مٹ جائیں۔ انتشار ختم ہو جائے، اسلامی شریعت پر عمل کیا جائے، یہ ھدف ہے۔ غلطیوں کے ارتکاب میں کمی غلبۂ خطا سے بہتر ہے۔ اسلام اور دوسرے نظاموں میں یہ امتیاز باقی رہنا چاہیئے کہ ڈپلومیسی کے نام پر اسلامی ممالک فریبی سیاست میں ملّوث نہ ہوں، داخلی سطح پر ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانی نہ کریں۔ غیر مسلموں میں انسانی سطح کے اقدار و اخلاق کو تقویت پہنچائیں۔ ڈیموکریسی کے نام پر قول و فعل میں تضاد کا آئینہ دار مکر و فریب رائج ہے۔ اس سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔

۱۲۔ قرآن کے بین الاقوامی ارشادات

۱۔ خالق کی رحمانیت کا عموم اور ربوبیت کی ہمہ گیری۔ (بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم، میں رَحْمٰن کا ربط تمام موجودات سے ہے)

۲۔ ہمہ گیر ایمان کا اعلان (البقرۃ آیت ۴)

۳۔ دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں (البقرۃ: ۲۵۶) دعوت الی اللہ میں جبر و اکراہ جائز نہیں۔

۴۔ امداد باہمی اور خیرات میں مذہب و ملّت کا سوال نہیں (البقرۃ: ۲۷۲)

۵۔ انسانی برادری اور ان کے حقوق کی تاکید (النساء: ۱) (مسلم وغیر مسلم پڑوسی اور ہم معاشرہ کے حقوق۔ رشتہ داروں کے حقوق، لوگوں کے حقوق)

۶۔ مسلم معاشرہ میں غیر مسلم کو صفائی کا پورا موقعہ دینا ضروری ہے (النساء ۱۰۵۔۱۱۴۔ تاکید و ترغیب)

۷۔ دوست اور دشمن کی تفریق کے بغیر عدل وانصاف کی ذمہ داری (مائدہ ۸)

۸۔ دوسروں پر نکتہ چینی کے بجائے خود اپنی خبر لیں (المائدۃ: ۱۰۸)

۹۔ اللہ کو جبر سے کام لینا منظور نہیں (یونس: ۹۹)

۱۰۔ انداز تبلیغ و دعوت میں صبر و برداشت کی ضرورت (النحل: ۱۲۵۔۱۲۷)

۱۱۔ آپؐ کا فیض تمام عالمین کے لئے ہے (الانبیاء: ۱۰۷)

۱۲۔ عبادت گاہوں کا احترام (الحج: ۴۰)

۱۳۔ بہتر سے بہتر اچھائی سے برائی کا دفعیہ (المؤمنون: ۹۷)

۱۴۔ بندگان الٰہی کی شان۔ تواضع و فروتنی (الفرقان: ۶۳)

۱۵۔ حسن انجام کا انحصار عام لوگوں کی خیر سگالی (القصص: ۸۳)

۱۶۔ ذات اور برادری (قبیلہ) کے لحاظ سے اونچ نیچ کا خاتمہ اور فضیلت و بزرگی کا کردار پر انحصار۔ (الحجرات: ۱۳)

۱۷۔ بلا تفریق فرقہ، حسن سلوک اور انصاف پروری (الممتحنہ: ۸)

۱۸ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے انسان کے داؤ پر لگایا گیا تا کہ وہ غور و فکر کرے۔ (الجاثیہ: ۱۳)

شیعہ امامیہ اور عزاداری

شیعہ امامیہ کے وجہ تسمیہ پر گزشتہ ابواب میں روشنی ڈالی جا چکی ہے، عزاداری سے مراد ہے "ماتم پرسی کی یادگار قائم کرنا۔" اصطلاح میں اس سے مراد کربلا کے شہیدوں کے واقعات کو یاد کرکے رونا، رلانا ہے۔ تاریخ میں سنی و شیعہ حوالوں سے ثابت ہے کہ اولین مجلس عزا یزید کے محل میں ہی منعقد ہوئی۔ زوجہ یزید مومنہ اور محب اہل بیتؑ تھی۔ جب اس نے سنا کہ جناب زینبؑ، جناب ام کلثومؑ اور اہل بیت رسولؐ کی دوسری خواتین بے پردہ دربار میں، اغیار کے درمیان لائی گئی ہیں، وہ محل خانہ سے نکل کر سر برہنہ دربار میں آکر اپنا سر پیٹنے لگی، اس نے یزید کو کوستے ہوئے اسے اس کا احساس دلایا۔ چنانچہ یزید نے اپنی خجالت پر پردہ ڈالنے کیلئے اپنی زوجہ کی تحریک پر لٹے ہوئے کربلائی قافلہ کو محل سے ایک الگ تھلگ مکان میں جگہ دی۔ جناب زینبؑ نے یہاں مجلس عزا کو برپا کیا، جس میں وہ معظمہ پہلے حمد باری تعالیٰ کو بیان فرماتی تھیں، پھر سیرت طیبہ رسول اللہؐ کا تذکرہ ہوتا تھا، پھر اہل بیت رسولؐ کی تعریف و فضل کا بیان ہوتا تھا، پھر واقعہ کربلا کے دلدوز حالات کو جگر سوز اور پر درد لہجہ میں پیش کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آپؑ کے فصیح و دلپذیر بیان و بکا کے نتیجہ میں، محل کے دوسرے مکانوں سے بھی رونے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ چنانچہ دلوں تک یہ حال دیکھ کر یزید نے اسیران کربلا کو محل سے دور ایک پرانے قید خانہ میں رکھا۔

شام کے عام لوگوں کو، جو ائمہ جمعہ کے ذریعے علیؑ و آل علی پر (اموی اقتدار کی جانب سے) سب و شتم اور بہتان تراشیوں کی پروپگنڈا مشینری کا بہت حد تک شکار ہو چکے تھے، واقعہ کربلا کے محرکات اور پس منظر کا احساس

ہونے لگا تھا۔ ایک روز یزید نے جامع مسجد دمشق میں نماز جمعہ کے موقع پر امام زین العابدینؑ کو قید خانہ سے بلایا، شامی خطیب سے کہا کہ "منبر پر چڑھ کر خطبہ دے"۔ جب اس نے حسب معمول علیؑ و آل علیؑ پر سب و شتم کیا اور یزید و بنوامیہ کی تعریف کی تو امام زین العابدینؑ نے کھڑے ہو کر اس کی مذمت کی، پھر یزید سے کچھ بیان کرنے کی اجازت چاہی، لوگوں نے یزید سے اصرار کیا کہ وہ اہل حجاز کی فصاحت کے قائل ہیں اور ان سے کچھ سننا چاہتے ہیں۔ امام منبر پر گئے اور حمد و ثنا کے بعد شان اہل بیتؑ اطہار اور واقعہ کربلا کے پس منظر میں حقائق سے پردہ اٹھایا۔ آپؑ نے درد بھرے لہجہ میں گریہ فرماتے ہوئے امام مظلومؑ کے تشنہ دہن قتل ہونے کا ذکر فرمایا تو یہ مجمع مجلس عزا میں بدل گیا۔ اہل بیتؑ کی محبت نے دلوں میں جوش مارا اور گریہ کا سماں چھا گیا۔ اس طرح مجالس عزاداری کا آغاز ہوا جس کا مدعا واقعہ کربلا کے وقوع کے اسباب کو اجاگر کرنا تھا۔ امام زین العابدینؑ کی مجالس عزا سے تشدد اور انسانیت سوز مظالم کے خلاف نفرت پیدا ہونے لگی۔ مقصد شہادت حسینؑ کے عوامل روشن ہونے لگے اور اہل بیتؑ کے علم و سیرت سے استفادہ کے مواقع پیدا ہوتے گئے۔ جن سے اسلام اور انسانیت کے مفاہیم کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

ائمہ طاہرینؑ نے امام حسینؑ کی مظلومیت کا تذکرہ کرنے کے لئے مجالس عزا کا منعقد کر دیا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے اس وقت گریہ فرمایا تھا جب حضرت جبرئیلؑ نے شہادت امام حسینؑ کی خبر دیتے ہوئے کربلا کی مٹی بھی دی تھی جس کو آپؐ نے اشکبار ہو کر ام المومنین جناب ام سلمہؓ کو شیشی میں بند کر کے دے کر فرمایا تھا "جس روز یہ مٹی خونیں ہو جائے سمجھنا میرا یہ لاڈلا حسینؑ شہید کر دیا گیا ہے!"۔۔۔ تربت امام حسینؑ کی مٹی آج دنیا میں جہاں

کہیں بھی موجود ہے، روز عاشورا خونیں ہو جاتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ خاص طور سے ان مجالس کا اہتمام فرماتے تھے۔ انہوں نے منظوم مرثیہ کے لئے شعراء ذاکرین کو تحائف سے نوازا۔ بارہویں امام کی غیبت کے بعد فقہا، مجتہدین نے بھی مجالس عزا کا اہتمام فرمایا۔

عزاداری کے فائدے

۱۔ مجالس عزا اسلامی تبلیغات کا بہترین وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ تذکرہ واقعات کربلا سے تمام مسلمان، خصوصاً مذاہب خمسہ (کم و بیش) استفادہ کرتے ہیں۔ ۲۔ مجالس عزا میں سیرت اہل بیتؑ سے سامعین کو روشناس کرتے ہیں۔ ان کی پاک زندگی کے واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے جس سے معاملات میں حق کی پاسداری کا احساس بڑھتا ہے۔ شوق عمل اور جرأت کردار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اپنے محبوب مولا حسینؑ کے لئے اظہار عشق کرتے وقت یہ راز منکشف ہو جائے کہ خود اُن جنابؑ کو اپنے نفس اور اعزہ و انصار سے عزیز تر کونسی چیز تھی تو اس کے فکر و عمل میں انقلاب برپا ہو جائے۔ ۳۔ مجالس عزا میں شرکت سے مکر و فریب اور ظلم و تشدد سے نفرت پیدا ہوتی ہے، قانون شریعت سے حیا کرنے اور اللہ سے خوف کھانے میں اضافہ ہوتا ہے۔

۴۔ عصر عاشور، رسول اللہؐ کی لخت جگر، خاتون جنت جناب فاطمہ زہراؑ کی بیٹیوں کے سر سے چادر چھین لی گئی۔ منافقین نے اس گھرانے کی بیٹیوں سے زیور اور کپڑے تک چھین لئے۔ سکینہ بنت الحسینؑ کے کانوں سے دُر کھینچ کر چھین لئے۔ یہ امام حسینؑ کی شہادت کے فوراً بعد ہوا۔ خیموں کو لوٹ لیا گیا پھر آگ لگا دی گئی۔ اس وحشیانہ گراوٹ کو یاد کر کے انسان

اپنی انانیت اور حیوانیت پر شرمندہ ہو جاتا ہے۔ عملی طور پر عزادارانِ حسینؑ عموماً دنیا کے سماجی وسیاسی حادثات کے اندر پھنس جانے پر، لوٹ مار میں ملوث ہونے سے احتراز کرتے ہیں۔ ۵۔ مرثیہ گوئی سے زبان وادب میں ترقی ہوتی ہے، ایثار و مروّت کی قدروں کو تقویت ملتی ہے۔ لوگ شوق سے ایک دوسرے کو کھلانے پلانے میں مسرت محسوس کرتے ہیں جو مومنانہ علامت ہے۔ سبیل دیتے ہیں، بھوکوں کو کھلانے اور پیاسوں کو پانی پلانے سے نیکی کا جذبہ بڑھتا ہے، نیک بننے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ معاشرہ میں امن وسلامتی کے قیام کا ولولہ اجاگر ہوتا ہے اور اعلیٰ مقاصد کے لئے انسان، جان تک قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ ۶۔ عزاداری سے مقاماتِ مقدسہ کی زیارات کا شوق اور سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کا ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مختلف قوموں، ملتوں اور ملکوں کے سماجی وسیاسی حالات کی واقفیت کے لئے بالواسطہ یا بلاواسطہ مواقع کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ تاریخ اسلام کے نشیب وفراز کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔ صالح تجارت اور اقتصادی روابط کو وسعت ملتی ہے۔ ۷۔ علماء (واعظین) مجلس عزا کے آغاز میں قرآنی آیت کا حوالہ دیتے ہیں، اس موضوع پر احادیث اور معتبر روایات کے حوالوں سے، کلام، فقہ، اخلاق وسیرت، اور تاریخ وسیاست پر روشنی ڈالتے ہیں۔ روضہ خوانی (مرثیہ خوانی) کو حمدِ باری سے شروع کیا جاتا ہے، پھر سیرت النبیؐ اور معجزات انبیاءؑ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ معروف اسلامی واقعات کا بیان ہوتا ہے، پھر ائمہ طاہرینؑ کے علم وفضل، شرف وکمالات اور ان کے بلند وپاکیزہ اخلاق پر مؤثر انداز میں

روشنی ڈالی جاتی ہے۔ آخر میں صبر واثبات اور ایمان وایقان کے مظاہر، واقعات کربلا کا بیان پُر درد لہجہ میں ہوتا ہے۔ انسان میں مصائب وابتلاء پر تحمّل کے ساتھ ثابت قدم رہنے کا مادہ بڑھتا ہے۔ توسل، توکل اور یقین کے مراحل شناخت میں ترقی ہوتی ہے۔ ۸۔ عموماً جب کسی مسلم خصوصاً عزادار شیعہ مسلم کا کوئی عزیز رحلت کرتا ہے یا کسی حادثہ میں جان بحق ہوتا ہے۔ تو شہداء کربلا کی یاد سے جدائی کا داغ دھل جاتا ہے۔ مثلاً جوان بیٹے کی جدائی کا غم ہو تو جناب علی اکبرؑ یا جناب قاسمؑ کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔ کمسن یا شیرخوار بچے کا غم ہو تو شش ماہہ شہید علی اصغرؑ کا مرثیہ، بھائی کی جدائی کا داغ ہو تو حضرت عباسؑ کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے بہن کے گزرنے یا بیٹی کے جوان مرگ ہونے کی یاد ستاتی ہو تو جناب زینبؑ وجناب سکینہؑ کے صبر وثبات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ بیوی کے گزرنے پر کسی کو پُرسہ دینا ہو تو جناب ام لیلیٰ وجناب رُباب کے آلام ومصائب کی یاد تازہ کرکے اس کو تسلّی دی جاتی ہے۔ کسی عزیز دوست کے گزر جانے کے صدمے کو، حبیب ابن مظاہرؓ، مسلم بن عوسجہؓ وغیرہ کے تذکرہ سے مندمل کیا جاتا ہے۔ ۹۔ مجلس عزا ایک عظیم انسانی درس گاہ ہے جس میں واقعات کربلا کا تذکرہ، دوست کو مصیبت میں ساتھ دینے کا مثالی سبق سکھاتا ہے۔ بھائی بہن کے فطری رشتے کے تقاضوں، باپ بیٹے، باپ بیٹی، ماں واولاد، چچا بھتیجے وغیرہ کے تعلقات کی عظیم مثالیں یاد دلاتا ہے۔ تذکرہ کربلا سے امیر کے حکم کی متابعت اور امام سے وفاشعاری کی لذّت آشنائی ہوتی ہے۔ دیانت، متانت،

ذہانت، جرأت اور شجاعت کا درس ملتا ہے۔ مصیبت پر صبر اور نعمت و فراوانی میں شکر و ایثار کے پھول کھلتے ہیں، مُردہ اور بے جان دلوں میں امید و توکل کی کلیاں پھوٹتی ہیں۔ تکبّر اور کفرانِ نعمت سے اجتناب کرنے کی دور اندیشی پیدا ہوتی ہے، اس طرح اہل بیتؑ کے وسیلۂ نجات ہونے کا مفہوم نکھر جاتا ہے۔ ۱۰۔ عزاداری انسان کو باعمل بنا دیتی ہے۔ سزا و جزاء اور عدل کے مفاہیم کو موثر انداز میں سمجھاتی ہے۔ صالح زندگی گزارنے پر آمادہ کرتی ہے۔ سازشی ذریعہ سے مطالب کو حاصل کرنے سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ ظلم و تشدد کے خلاف ابھارتی ہے، دین کا جذبہ راسخ کرتی ہے، اتحاد کا درس دیتی ہے۔

عزاداری کا طریقہ

عمومی طریقہ یہ ہے کہ مبلّغ، وعظ (مجلس) پڑھتا ہے، وہ اپنے بیان کو کربلا کے کسی پُر درد واقعہ سے جوڑ کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد ذاکر سوز خوانی (مرثیہ خوانی) کو کلام سے اس کے ساتھ ربط دیتا ہے، جس میں مذکورہ واقعہ کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کے بعد سینہ زنی (ماتم) کی جاتی ہے بڑے امام باڑوں میں کئی کئی واعظین ایک ہی مجلس میں یکے بعد دیگرے خصوصاً خاص ایام میں، وعظ خوانی کرتے ہیں۔ اختتام پر "ماتم" کے ساتھ ملبوس علم شریف برآمد ہوتا ہے۔ ماتمی دستے نوحہ خوانی کرتے ہوئے سینہ زنی کرتے ہیں۔ جلوس عموماً کسی امام باڑہ میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔

ماتم کے نشانات

۱۔ علَم :۔ یہ حضرت عبّاسؑ (علمدارِ کربلا) کے علَم کی یاد تازہ کرنے والا شبیہ ہے، اوپر کے سرے پر پنجہ (چاندی کا بنایا ہوا ہاتھ) لگایا جاتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ حق کا معنوی ہاتھ کسی بھی حالت میں دستِ ظالم میں نہ دیا گیا بلکہ ہمیشہ اونچا رہا۔ پنجہ کے علَم میں مختلف رنگوں کے پارچوں کو لٹکایا جاتا ہے، جو تاریخ اسلام میں استعمال کئے گئے متعدد رنگوں کے جھنڈوں (رایتوں) کی معنوی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً جناب حمزہؓ نے جو علَم ساتھ لیا تھا اس کا رنگ زرد تھا، خیبر کی جنگ میں علم لشکرِ اسلام سفید تھا، حضرت علیؑ کا نشانِ لشکر سفید بھی تھا اور سبز بھی، بعض غزوات میں سبز رنگ کا پرچم لشکرِ اسلام کی نشانی تھی۔ امام حسینؑ نے جو علَم کربلا میں حضرت عباسؑ کے ہاتھ دیا تھا اس کا رنگ "سُرخ" تھا۔ امام رضاؑ نے ولی عہدی کے زمانہ میں سبز رنگ کے نشانات مقرر فرمائے تھے۔ یہاں علَم کے رنگوں سے غرض نہیں ہے، نہ اس کو کسی مادّی حیثیت سے متبرک مانا جاتا ہے بلکہ یہ تاثر معنوی ہے۔ علَم پر عموماً آیات قرآنی اور پنجتن پاکؑ کے اسمائے گرامی کشیدہ ہوتے ہیں۔ عموماً لوگ ان کو مَس کرتے ہیں۔ کسی کھائے جانے والی چیز کو مَس کرکے بطور تبرک کھاتے اور کھلاتے ہیں۔

۲۔ شبیہ ذوالجناح :۔ ذوالجناح امام حسینؑ کے گھوڑے کا نام تھا۔ شبیہ ذوالجناح نکال کر لوگ یہ یاد کرتے ہیں کہ یہ گھوڑا اپنے مالک

کے بغیر خیمہ گاہ کی جانب آیا تھا۔ امام باڑہ کے داخلی دروازہ کو خیمہ گاہ کی شکل میں تعمیر کیا جاتا ہے۔ متعدد علاقوں خصوصاً ہندوستان میں تعزیے نکالے جاتے ہیں۔ جو ائمہ و شہدائے کربلا کے روضوں کی نشانی ہوتی ہے۔ کہیں پر علی اصغرؑ کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے گہوارہ بھی بنایا جاتا ہے۔ نشانات عزاداری مسنون طریقوں پر بھی مستعمل ہیں اور رسموں پر بھی۔ مباح رسوم کو مجتہدین کرامؒ زمان و مکان کے لحاظ سے ممنوع قرار دے سکتے ہیں، جس طرح قمہ زنی کو ممنوع قرار دیا گیا۔ البتہ خالی زنجیروں کا استعمال بعض علاقوں میں ہوتا ہے۔ غم حسینؑ میں رونے، نالہ و فریاد بلند کرنے اور سینہ زنی کرنے کو علماء مجتہدین نے ناجائز قرار نہیں دیا ہے۔

یادگار حسینیؑ کی مناسبت سے، خصوصاً ایام محرم کے دوران لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ جس میں امیر و غریب کا حقہ، سبھی (صاحبان نذر) حصہ لیتے ہیں، طبی ریلیف مہیا کیا جاتا ہے، نادار بیماروں کے لئے بلڈ کیمپ منعقد کئے جاتے ہیں۔ حسینیؑ تحریک پر لٹریچر تقسیم کیا جاتا ہے۔ 'یوم حسینؑ' کے نام سے بیرونی مجالس کا انعقاد ہوتا ہے، فحش دھنوں پر نوحہ خوانی ممنوع ہے۔ سڑکوں، گلیوں میں سینہ کوبی کے دوران ماتم کرنے والے مردوں کیلئے تن ڈھانپ کر رکھنے کی تاکید ہے۔

بعض پیشہ ور واعظین اور ذاکرین عشق حسینیؑ کا استحصال کرکے لوگوں کو اپنے مفادات کی خاطر گروپوں میں تقسیم کرتے ہیں جسکی مذہب میں اجازت نہیں ہے۔ مراثی میں واقعات و عقائد کی صحیح نشاندہی کیلئے مرثیہ نگار شعراء کیلئے لازم ہے کہ وہ علماء و مجتہدین اور مستند روایات سے نصوص قرآن و اسوۂ معصومینؑ کے مطابق استفادہ کریں تاکہ خلاف دین و شریعت تحریف واقع نہ ہو جائے۔ عزاداران حسینؑ میں جہاں بدنظمی، گروپ بندی اور بے عملی ہوتی ہے اس کا لازمی سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ مجموعاً عزاداری کے مفاہیم کو سمجھنے سے

عن علی علیہ السلام :-

• وقد علمتم موضعي من رسول الله بالقرابة القريبة والمنزلة
الخصيصة وضعني في حجره وانا ولد يضمني الى صدره
ويكنفني في فراشه ويمسني جسده ويشمني عرفه

نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۲

تم جانتے ہی ہو کہ رسول مقدس سے قریب کی عزیزداری اور مخصوص قدر و منزلت
کی وجہ سے میرا مقام ان کے نزدیک کیا تھا۔ میں بچہ ہی تھا کہ رسولؐ نے مجھے گود میں لیا تھا۔ اپنے
سینے سے چمٹائے رکھتے تھے۔ بستر میں اپنے پہلو میں جگہ دیتے تھے۔ اپنے جسم
مبارک کو مجھ سے مس کرتے تھے اور اپنی خوشبو مجھے سنگھاتے تھے۔

• الى ان بعث الله سبحانه محمدا رسول الله صلى الله عليه وآله
واهل الارض يومئذ ملل متفرقة واهواء منتشرة وطوائف
متشتتة فهداهم من الضلالة وانقذهم بمكانه من الجهالة۔

نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱